VOLUME: 8

ISSUE: 10-12

ISSN: 2454-4035

OCTOBER-DECEMBER 2021

انوار تحقیق

مدیران اعزازی

پروفیسر صاحبزادہ صولت علی خان

پروفیسر ای اے حیدری

مدیر اعلی

سید الیاس احمد مدنی

ANWAR-E-TAHQEEQ October-December 2021

VOLUME: 8

ISSUE: 10-12

ISSN: 2454-4035

OCTOBER-DECEMBER 2021

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magazine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

HONORARY EDITORS

PROFESSOR SAHEBZADA SAULAT ALI KHAN

PROFESSOR E. A. HAIDARI

CHIEF EDITOR

SYED ILIYAS AHMAD MADNI

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۸ شمارہ۔۱۰تا۱۲ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۲۱ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۱۰۰روپئے سالانہ:۔۱۰۰۰روپئے

نگراں:۔**سید عادل احمد**، محکمہ آثارقدیمہ، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

مدیران اعزازی:

صاحبزادہ پروفیسر صولت علی خان

پروفیسر ای اے حیدری

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔008 500

موبایل نمبر:۔09966647580،09667489786 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔مانو, حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر محمد احتشام الدین، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔ اے ایم یو، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر۔اے ایم یو۔علی گڑھ

ڈاکٹر احمد نوید یاسر، اے ایم یو۔علی گڑھ

شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد، دکن

متبع علی خان۔ایڈیٹر اردو خبر ڈاٹ ان، حیدرآباد، دکن

ریویو کمیٹی

پروفیسر مسعود انور علوی۔علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔لکھنؤ

پروفیسر عزیز بانو۔حیدرآباد

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان۔مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
	اداریہ		۳
۱	ڈاکٹر کاظم علی خاں کا تحقیقی شعور ''غالب اور منشی نول......	پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی	۴
۲	برہمن زادۂ رمز آشنائے روم	پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید	۱۸
۳	اسلم جیراجپوری کی علمی فتوحات	پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی	۲۸
۴	اخلاق کریمانۂ اہل تصوف: طالب آملی کے ایک......	سید فیض علی شاہ قادری نیازی	۳۹
۵	مسعود سعد سلمان کی فارسی شاعری بارہ ماسہ کے......	ڈاکٹر محمد توصیف	۴۴
۶	شہریار کی شاعری میں تہذیبی حسیت اور عصری شعور	ڈاکٹر مبشرہ صدف	۵۰
۷	مکتوبات مخدوم حسین نوشتہ توحید	محمد عاصم	۵۶
۸	مرآت العروس میں تربیت نسواں کے مسائل......	سید محمد ظفر اقبال	۶۱

اداریہ

تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی، استحکام اور روشن مستقبل کی ضمانت ہوتی ہے۔ یہ انسان کو نہ صرف پڑھنے لکھنے کی صلاحیت دیتی ہے بلکہ اسے شعور، فہم وفراست اور اپنی زندگی بہتر بنانے کے طریقے بھی سکھاتی ہے۔تعلیم انسان کے ذہن کی کایا پلٹ دیتی ہے، اسے جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم وآگہی کی روشنی میں لے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ قوم نے تعلیم کو اولین ترجیح دی ہے، کیونکہ کسی بھی ملک کی تعمیر وترقی کا دارومدار تعلیم یافتہ افراد پر ہوتا ہے۔تعلیم کا مقصد صرف نمبروں کا حصول یا ڈگری لینا نہیں، بلکہ ایک ایسا ذہن تیار کرنا ہے جو سوچ سکے، تحقیق کر سکے اور اپنے معاشرے کی بہتری میں کردار ادا کر سکے۔ایک تعلیم یافتہ شخص میں نہ صرف خوداعتمادی ہوتی ہے بلکہ وہ بہتر گفتگو، بہتر رویوں اور بہتر معاشرتی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتا ہے۔تعلیم اخلاقی تربیت کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جو انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔معاشی ترقی میں بھی تعلیم کا کردار بنیادی ہے۔ جدید دنیا میں ہنر اور علم کی بنیاد پر ہی روزگار اور ترقی کے مواقع میسر آتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ نئی ٹیکنالوجی سے بہتر طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں اور معاشرے کے لیے نئے راستے کھولتے ہیں۔ایک ملک کی معیشت اس وقت مضبوط ہوتی ہے جب اس کا نوجوان تعلیم یافتہ ہو، ہنرمند ہو اور نئے خیالات کو عملی شکل دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

تعلیم معاشرتی ہم آہنگی اور برداشت کو بھی فروغ دیتی ہے۔ جب لوگ باشعور ہوتے ہیں تو وہ اختلاف رائے کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں، ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں اور ایک پرامن معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔تعلیم خواتین کے حقوق اور ان کی سماجی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت نہ صرف اپنے گھر کی بہتر تربیت کر سکتی ہے بلکہ معاشرے کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ابھی بھی بہت سے لوگ تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں۔خصوصاً دیہی علاقوں میں بچوں کا اسکول جانا ایک چیلنج سمجھا جاتا ہے۔غربت، وسائل کی کمی، اور معاشرتی سوچ بہت سے بچوں کو تعلیم سے محروم کر دیتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اور معاشرہ مل کر ایسے اقدامات کرے کہ ہر بچہ، خواہ امیر ہو یا غریب، تعلیم حاصل کر سکے۔ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ تعلیم پر کیا گیا ہر خرچ مستقبل میں بہترین سرمایہ کاری ہے۔

آخر میں، تعلیم ایک روشنی ہے جو انسان کے اندر چھپی صلاحیتوں کو روشن کرتی ہے، اس کی زندگی کو سنوارتی ہے اور اسے معاشرے کا مفید شہری بناتی ہے۔قومیں اسی وقت ترقی کرتی ہیں جب ان کے افراد تعلیم یافتہ، مہذب اور آگاہ ہوتے ہیں۔لہٰذا ہمیں تعلیم کو اپنی اولین ترجیح بنا کر ایک روشن اور مضبوط مستقبل کی بنیاد رکھنی چاہیے۔

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی
صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

ڈاکٹر کاظم علی خاں کا تحقیقی شعور ''غالب اور منشی نول کشور'' کی روشنی میں

آغشته ایم هر سرخاری به خون دل
قانون باغبانی صحرا نوشته ایم (غالب)

درس گال تحقیق کا شیوہ مکتب عشق کے نرالے انداز سے بڑی حد تک مطابقت ومماثلت رکھتا ہے، یعنی اگر عشق کا سعادت آثار چھٹی سے محروم ہو جاتا ہے تو تحقیق کا اطاعت شمار اور آگے بڑھیں گے دم لے کر گنگناتا ہوا علمی فتوحات تحقیقی نگارشات اور ادبی ترکتازیوں میں ایسا مصروف ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی سدھ بدھ تک نہیں رہتی ہے۔قلم وقرطاس سے وابستہ اور مخطوطات ومطبوعات کے پابستہ حضرات کے احوال و کوائف اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ایک تحقیقی کاوش کو حلیہ طبع سے پیراستہ ہونے تک کے مرحلہ میں نادر وکمیاب بلکہ نایاب مخطوطات ومطبوعات کی تلاش کے ہفت خواں کو سر کرنے، شکستہ، کرم خوردہ، آب دیدہ، بدخط، ناقص اور ان سب سے بڑھ کر کم سواد کاتبوں کی دست درازیوں کے شکار قلمی نسخوں کی قرآت، نامکمل نسخوں کے مصنفین وموضوعات کے تعین میں داخلی شہادت اور گمان وقیاس بھول بھلیوں سے بہ حفاظت نکل کر شرح صدر ویقین کے شیش محل تک رسائی کے لیے جس مبلغ علم، وسعت مطالعہ، استحضار، ژرف نگاہی، جودت طبع محققانہ بصیرت ناقدانہ نظر مشق ومزاولت، حزم واحتیاط نظم وضبط، صبر وسکون کی ضرورت ہوتی ہے اسے منانہ تحقیق کا رند بلانوش ہی سمجھتا ہے دوسرے کیا جانیں۔

نشہ مئے تجھ کو کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ڈاکٹر کاظم علی خاں کا شمار تہذیب وثقافت کے گہوارہ اور علم وفضل کے مرکز یعنی شہر نگاراں لکھنو کی اہم ادبی شخصیات میں ہوتا تھا، اولاً وہ شبعہ انگریزی اور اس کے بعد شعبہ اردو شیعہ پوسٹ گریجویٹ کالج لکھنو میں درس وتدریس سے وابستہ رہے، ان کے اندر ایک اچھے استاد کی تمام خصوصیات موجود تھی، لیکن بنیادی طور پر وہ ایک محقق تھے جس کی شاہد ان کی گراں قدر نگارشات کی بڑی تعداد اور بلا مبالغہ سیکڑوں تحقیقی مقالے ہیں، حلقہ درس ہو یا نجی گفتگو، سمینار ہو یا ریڈیائی نشریات علمی مذاکرہ ہو یا کوئی دیگر تقریب ہر جگہ وہ ایک بلبل خوش نوا کی طرح چہکتے تھے۔محافل ومجالس میں ان کی گفتگو سنجیدگی سے سنی جاتی تھی، دوسروں کے مقالوں کو بھی وہ نہایت توجہ سے سنتے تھے اور نہایت سنجیدگی وشائستگی سے سوالات بھی قائم کرتے تھے، جواب شافی نہ ملنے تک وہ کسی رو رعایت کے بغیر کسی کو چھوڑتے نہیں تھے چاہے وہ نو آموز ہو یا کہنہ مشق،

بڑے سے بڑا حقق ہو یا مبتدی، مقام افسوس ہے کہ اردوادب کے اس نامور محقق ونقاد کی ادبی قدر و قیمت کا ان کے شایان شان تعین نہ ہوسکا۔ یہ سیمینار حقیقت میں کاظم فراموشی کی پہلی قسط ہے جس کے لئے اس سیمینار کے منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے ملک بھر سے صف اول کے محققین کو مقالہ کے لئے مدعو کیا جو اس دوروزہ قومی سیمینار میں ڈاکٹر کاظم علی خاں کی شخصیت اور علمی خدمات پر گراں قدر مقالے پیش کریں گے اور کاظم شناسی کی سمت ورفتار متعین کرنیکا سلسلہ شروع ہوگا۔

راقم السطور نے اس مقالہ میں ڈاکٹر کاظم علی کے ایک مقالہ "غالب اور منشی نول کشور (۱) کی روشنی ان کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لینے کی طالب علمانہ کوشش کی ہے یہ گفتگو جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اپنے عہد کی ہمہ جہت شخصیت اور اردو و فارسی کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۸۲۹ء۔۱۷۹۷ء) اور انیسویں صدی کے معروف ترین مطبع اور مقبول ترین اخبار اودھ اخبار کے مالک منشی نول کشور (۱۸۹۵ء۔۱۸۳۲ء) کے درمیان دوستانہ مراسم کے ذکر پر مشتمل ہے، جس میں اودھ اخبار کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر کاظم علی نے اپنے مقالے میں سب پہلے مستند حوالوں کی بنیاد پر ۱۸ جولائی ۱۸۷۰ء (۲) کو غالب کے تحریر کردہ فارسی زبان کے خط سے اودھ اخبار کی خریداری کی اطلاع دی اور اس کے بعد آٹھ ذیلی عناوین کے تحت اودھ اخبار سے غالب کی غیر معمولی دلچسپی کے مندرجہ ذیل اسباب بیان کئے ہیں۔

(1) اودھ اخبار سے غالب کو دیار وامصار کی خبر میں ملا کرتی تھیں۔

(۲) اسی اخبار میں غالب اور ان کے شاگردوں یا دوستوں کے بارے میں خبریں چھپا کرتی تھیں۔

(۳) اودھ اخبار غالب اوران کے شاگردوں کی کتابوں کے اشتہار شائع کرتا تھا۔

(۴) اودھ اخبار میں کبھی کبھی غالب کے مخالفین کی ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں جن میں غالب یا ان کے ادبی آثار پر اعتراضات ہوتے تھے۔

(۵) یہ اخبار کبھی کبھی غالب کی حمایت میں حامیان غالب کی بھی تحریریں چھاپتا تھا۔

(۶) اودھ اخبار نولکشور پریس سے نکلتا تھا جہاں سے غالب کی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔

(۷) اودھ اخبار کے مطالعے میں غالب کی دلچسپی اس وجہ سے بھی تھی کہ یہ انہیں بلا قیمت صرف معمولی ڈاک خرچ ادا کرنے پر ملا کرتا تھا۔

(۸) اودھ اخبار سے غالب کے غیر معمولی شغف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس میں کبھی کبھی غالب اور ان کے شاگردوں کے ادبی آثار چھپا کرتے تھے۔ (۳)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اودھ اخبار کے ان سینتیس شماروں کی تفصیل دی ہے جن میں غالب، ان کے دوستوں یا شاگردوں سے متعلق اطلاعات فراہم ہوتی ہیں جن کی ادبی اہمیت مسلم ہے، ڈاکٹر کاظم علی خاں کی تحقیقی نگارشات کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ بنیادی مصادر پر ہی اعتماد کرتے تھے ثانوی ماخذ کو نہایت مجبوری میں استعمال کرتے تھے اودھ اخبار کے شماروں تک رسائی نہ ہونے کی صورت میں جب انہیں بعض

کتب اور رسائل وجرائد کا سہارا لینا پڑا تو انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں دیانت داری کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ملاحظہ ہو۔
اس مضمون میں اودھ اخبار لکھنو کے جن شماروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی فائلیں مختلف کتب خانوں میں ہیں جن تک سر دست راقم الحروف کی رسائی ممکن نہیں لہذا اودھ اخبار کے شماروں کے لیے راقم الحروف کو مندرجہ ذیل مصادر پر انحصار کرنا پڑا۔(۴)
اس کے بعد انہوں نے انتخاب فتنہ مرتبہ نادم سیتا پوری تحقیقی نوا اور مصنف پروفیسر اکبر حیدری، غالب نام آورم" مصنفہ نادم سیتا پوری ہنگامۂ دل آشوب" مرتبہ سید قدرت نقوی، صحیحہ لاہور" علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، غالب نامہ دہلی اور کی مکمل تفصیلات درج کردی ہیں۔
اودھ اخبار کے ان شماروں اور میں شائع شدہ اطلاعات کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔
(1)اودھ اخبار مورخہ ۱۲، مارچ ۱۸۶۳ء ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں غالب کے ستر اشعار پر مشتمل قصیدہ پر انعام کی تجویز ہو رہی ہے لیکن غدر کا واقعہ پیش آنے کے باعث ناکامی ہوئی اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

نطقم نخست زمزمه خونچکاں دید

کز خون طراز سر ورق داستان دید

(۲) مورخہ ۲۵ مارچ ۱۸۶۳ لفٹنٹ گورنر سے خلعت فاخرہ ملنے کی خبر۔
(۳) مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۳ منشی نولکشور کے سفر دہلی کی روداد میں غالب سے ملاقات کی خبر جس میں نولکشور نے غالب کی خوب تعریف کی ہے۔ (ص ۸۵۲)
(۴) مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۷۳ء غالب کی تعریف میں (شاید) منشی نول کشور کی تحریر (ص ۶۸۱)
(۵) مورخہ ۱۱ فروری ۱۸۶۳، شاگرد غالب نواب شہاب الدین خاں ثاقب دہلوی کے یہاں فرزند کی ولادت کی خبر (ص ۱۱۷)
(۷)و(۶) مورخہ ۱۴، فروری ۱۸۲۳ء اور ۲ مئی ۱۸۷۵ء کے دو شماروں میں منشی ہر گوپال تفتہ اور غالب کی تعریف
(۸) ۱۸۲۳ء کے متعدد شماروں میں غالب کے شاگرد نواب مردان علی خاں رعنا کی تعریف وتوصیف میں منشی نول کشور نے نوٹ لکھے تھے۔ رعنا ایک متمول خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور انگریزی سرکار کی ملازمت کے علاوہ کئی دیسی ریاستوں میں اہم عہدوں پر فائز ہوتے رہے تھے۔
(۹) غالب کے دوست مراز حاتم علی مہر کے وکالت صدر دیوانی و نظامت مما لک مغربی کے عہدہ پر تقرری کی خبر
(۱۰) مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۳ء
(۱۱) مورخہ ۱۳ فروری ۱۸۶۳ء
(۱۲) مورخہ ۴، مئی ۱۸۶۳ء
(۱۳) مورخہ ۳ جون ۱۸۷۳ء
(۱۴) مورخہ ۱۷ رجون ۱۸۶۳ء

(۱۵)مورخہ ۲۳جون ۱۸۶۳ء ان چھ شماروں میں غالب کی کلیات نظم (فارسی) کا اشتہار اردو زبان میں شائع ہوا۔

(۱۶)مورخہ ۱۸جنوری ۱۸۶۳ء

(۱۷)مورخہ ۲۶مارچ ۱۸۶۲ء

(۱۸)مورخہ ۲،اپریل ۱۸۶۲ء

(۱۹)مورخہ ۹،اپریل ۱۸۶۲ء مندرجہ بالا چاروں شماروں میں غالب کی کتاب قاطع برہان کا اشتہار شائع ہوا تھا۔

(۲۰)مورخہ ۱۱مارچ ۱۸۶۳ء اشتہار کتاب غنچہ راگ از مردان علی خاں رعنا۔

(۲۱)مورخہ ۲۰مئی ۱۸۶۳ء اشتہار مثنوی "قضاوقدر" از قدر بلگرامی

(۲۲)مورخہ ۲،مئی ۱۸۶۵ء اشتہار کتاب مسنبلستان از منشی ہرگوپال تفتہ۔

(۲۳)مورخہ ۲۵جون ۱۸۶۷ء غالب کے خلاف آغا علی شمس لکھنوی کی تحریر شائع ہوئی۔

(۲۴)مورخہ ۲،مئی ۱۸۷۵ء (ص ۲۹۸) اس شمارہ میں غالب کے نام ان کی حمایت میں ارسطو جاہ رجب علی خاں کا ۱۱،اپریل ۱۸۶۵ء کا تحریر شدہ خط شائع ہوا۔

(۲۵)مورخہ ۱۴مئی ۱۸۶۳ء غالب کی تائید میں مردان علی خاں رعنا کی اردو تحریر چھپی۔

(۲۶)مورخہ ۳۱،اپریل ۱۸۷۳ء اس شمارہ میں غالب کا ایک مضمون شائع ہوا جو سیاسی نوعیت کا تھا۔(ص ۱۸۲)

(۲۷)مورخہ ۲۴ستمبر ۱۸۶۲ء کے شمارہ میں مردان علی خاں رعنا کی بہادری کی تعریف میں غالب کا اردو مراسلہ شائع ہوا تھا،جس کا اولین ماخذ اودھ اخبار ہے۔

(۲۸)مورخہ ۲۵مارچ ۱۸۶۳ء (ص ۱۷۲) کے شمارہ میں منشی نول کشور کے نام خط غالب کا اردو خط شائع ہوا جس کا قدیم ترین ماخذ اودھ اخبار ہے۔

(۲۹)مورخہ ۳دسمبر ۱۸۷۳ء (ص ۸۶۱) اس شمارہ میں غالب کا اکتیس اشعار پر مشتمل فارسی قصیدہ شائع ہوا تھا جو لارڈ الگن کی مدح میں تھا اس قصیدہ کا قدیم ترین مطبوعہ ماخذ اودھ اخبار ہی ہے،باغ دودر مرتبہ وزیرالحسن عابدی صرف تمیں اشعار ہیں۔اس قصیدہ کا مطلع یوں ہے۔

بیا کہ مدح خداوند داد گویم
از آنچہ گفتم از ان پیش گویم (۵)

چھپا۔

(۳۰)و(۳۱)مورخہ ۱۰،اکتوبر ۱۸۲۵ء اور ۷،اکتوبر ۱۸۶۵ء کے دوشماروں میں رحیم میرٹھی کے نام غالب کا ایک طویل ترین خط

(۳۲)مورخہ ۱۴فروری ۱۸۲۵ منشی نول کشور کی مدح میں غالب کے شاگرد (مرزا ہرگوپال) تفتہ کا فارسی قصیدہ چھپا۔

(۳۳) مورخہ ۲۱ فروری ۱۸۲۵ء کے شمارے میں (مولوی) ہادی علی اشک کی وفات پر تفتہ کا فارسی قطعہ تاریخ شائع ہوا۔

(۳۴) مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۳ء سے ۲۲، اکتوبر ۱۸۶۲ء تک کے شماروں میں میاں دادخاں سیاح اور (مرادان علی خاں) رعنا شاگردان غالب کے ادبی آثار دستیاب ہوتے ہیں۔

(۳۵) مورخہ ۶ دسمبر ۱۸۲۲ء کے شمارہ میں غالب کے شاگرد شہاب الدین خاں ثاقب کی دس اشعار پر مشتمل اردو غزل چھپی۔

(۳۷) اودھ اخبار مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۷۳ء (ص ۵۶۲) کے شمارہ میں غالب کے شاگرد یوسف علی خان عزیز (م ۱۲۹۰ھ) کا ایک قطعہ چھپا (1)

اس کے بعد ڈاکٹر کاظم علی خاں نے نہایت دقت نظر اور جانفشانی سے آثار غالب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسی انیس تحریروں کے تراشے درج کئے ہیں جن میں منشی نول کشور'' اودھ اخبار اور نول کشور پریس کا ذکر موجود ہے جو اپنے عہد کی دو عظیم شخصیتوں کے درمیان دوستانہ روابط کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر صاحب کے معیاری نیز مثالی تحقیقی ذوق کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کاظم علی خاں کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ ان کو اپنے تحقیقی مضامین یا تصانیف کے سلسلہ میں کسی طرح کا تعاون ملتا تھا چاہے وہ مصادر کی فراہمی کی صورت میں یا کچھ اور وہ نہایت فراخ دلی سے سب کا شکریہ ادا کرتے تھے اس مضمون میں بھی انہوں نے اس روایت کا پاس رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے جو الفبائی ترتیب سے نذر ناظرین ہے۔

ا۔ آثار غالب، مرتبہ قاضی عبدالودود شمولہ علی گڑھ میگزین (۴۹-۱۸۴۸ء)۔ جناب اظہر مسعود رضوی لکھنو

۲۔ باغ دودر مرتبہ وزیر الحسن عابدی (پنجابی اکیڈمی پریس لاہور طبع ۱۹۷۰ء)۔ پروفیسر آغا سہیل، لاہور

۳۔ پنج آہنگ- مترجمہ محمد عمر مہاجر (ادارہ یادگار غالب کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء) قاضی عبدالودود، پٹنہ

۴۔ تحریر مرزا اسداللہ خاں غالب اکبر علی خاں عرشی زادہ

۵۔ تصویر- سید غلام حسنین قدر بلگرامی پروفیسر انیس اشفاق عابدی لکھنو

۶- خیابان غالب- نادم سیتاپوری (مدینہ پبلشنگ کراچی طبع اپریل) صباح الدین عمر لکھنو (۷)

۷۔ دعای صباح- مرتبہ کالی داس گپتا رضا (وِل پبلی کیشنز بمبئ طبع ۱۹۷۷ء) کالی داس گپتا رضا، بمبئ

مثنوی شعاع مہر- مرزا حاتم علی مہر امجد علی خاں لکھنو

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ کاظم علی خاں تحقیق میں کسی بھی طرح کی رورعایت کے قائل نہ تھے، اگر ایک طرف وہ کسی کے ادبی تعاون کا کما حقہ شکریہ ادا کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے تو دوسری طرف اطلاعات فراہم کرنے میں اگر کسی سے کوئی غلطی ہوگئی تو اسے فوراً ٹوک دیتے تھے چاہے وہ شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

معروف محقق وزیر الحسن عابدی کا شمار غالب شناسوں کی صف اول میں ہوتا ہے انہوں نے باغ دودر میں غالب کا وہ فارسی قصیدہ مثالیس شامل کیا ہے جو غالب نے لارڈ الگن کی مدح میں کہا تھا اس قصیدہ میں اشعار تعداد اکتیس ہے جو اودھ اخبار کے مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء

کے شمارہ میں شائع ہو چکا تھا۔ جب کہ عابدی صاحب نے صرف تیرہ اشعار درج کئے ہیں۔کاظم علی خاں ان کے سلسلہ میں کوئی سخت لہجہ اختیار کئے بغیر اس غلطی کی نشان دہی ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

داغ دود ورمرتبہ وزیرالحسن عابدی میں صرف تیرہ اشعار ہیں۔۔۔۔(۸)

ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب اور شاہان تیموریہ" نامی کتاب کے ص۲۰ پر ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں غالب کے قصیدے میں اشعار کی تعداد اناسی تحریر کی ہے۔اس پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

داکٹر خلیق انجم نے غالب کے اس قصیدہ کو خلاف واقعہ اناسی اشعار پر مشتمل بتایا ہے لیکن اشعار کی صحیح تعداد منتر ہے اس کے ثبوت میں کلیات غالب (نظم) مطبوعہ نول کشور پریس ۱۸۶۳ء کے ص ص ۲۵۶ تا ۲۶۰) کا حوالہ بھی دیا ہے۔(۹)

ماہر غالبیات مالک رام نے تلامذہ غالب" (ص (۲۱۹) میں غالب کے شاگرد سید غلام حسنین قدر کے انتقال کے دن کو سہوا یکشنبہ کے بجائے شعبہ لکھ دیا تھا اس کی تصحیح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

جناب مالک رام نے قدر کی تاریخ وفات ۱۴، ستمبر ۱۸۸۴ء کو خلاف تقویم شنبہ قرار دیا ہے۔(۱۰)

اس سلسلہ میں انہوں نے غالب کا بھی تعاقب کیا ہے۔غالب نے اپنے کلیات فارسی نظم کے سلسلہ میں سید بدرالدین کاشف کے نام خط میں تحریر کیا تھا کوئی مصرعہ میرا اس سے خارج نہیں (۱۱)

ڈاکٹر کاظم خاں نے غالب کے اس سہو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

یہاں پر بھی غالب سے کہو ہوا ہے، میری تحقیق ہے کہ میر مہدی مجروح کے مرتب کردہ تذکرے طلسم راز کے سال اتمام یعنی ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰-۱۸۴۹ء) کا غالب کا فارسی قطعہ تاریخ کلیات غالب طبع ۱۸۷۳ء سے باہر رہ گیا تھا،اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مضمون غالب کے بعض غیر معروف ادبی آثار مطبوعہ نیا دور لکھنو، جولائی ۱۹۸۱ء(ص ۱۲ تا ۱۳)(۱۲)

غالب کے ایک معروف شاگرد مالک اخبار مشیر قیصر ہندوا ڈیٹر اودھ اخبار غلام محمد خاں تپش نے امیر مینائی کی امیر اللغات کی اغلاط پر ایک مسلسل مضمون ''مشیر قیصر ہند میں تحریر کیا تھا،معروف محقق ونقاد وشاعر اور اردو میں قصیدہ نگاری (۱۹۵۸ء) کے مصنف ڈاکٹر ابو محمد سحر کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ مطالعہ امیر مئی ۱۹۶۵ء میں نسیم بک ڈپو لکھنو سے کتابی شکل میں شائع ہوا جس میں اس مضمون کا ذکر تک نہ تھا جب کہ دوسرے مصادر میں ملتا ہے۔سحر صاحب کی اس تحقیقی لغزش کی گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر ابو محمد سحر کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ مطالعہ امیر خاموش ملتا ہے حالانکہ'' آب بقا (خواجہ عبدالروف عشرت) طبع ستمبر ۱۹۲۸ء اور تلامذۂ غالب (مالک رام) میں تپش کے اس مضمون کا ذکر موجود ہے۔''(۱۳)

ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اس مضمون میں غالب اور منشی نول کشور سے تعلق رکھنے والے ایسے اشخاص کے بارے میں نہایت مفید اطلاعات فراہم کی ہیں ساتھ ہی ساتھ ایسے مصادر کی نشان دہی بھی کر دی ہے جن کی مدد سے ان پر مزید تحقیقی کام ہوسکتا ہے بخوف طوالت صرف

چند کا ذکر ملاحظہ ہو:

اشک، مولوی ہادی علی بجنوری، شیخ حسین علی بجنوری کے فرزند تھے (۱۴) فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی، شاعری میں انہوں نے فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ ان کا اردو دیوان بھی زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ اشک نول کشور پریس میں صحیح تھے، غالب کی کلیات فارسی نظم کی طباعت کے سلسلہ میں اشک کی بیماری کا ذکر غالب نے متعدد خطوط میں کیا ہے، لالہ سری رام اور مولانا فاضل لکھنوی نے اشک کا سنہ وفات ۱۱۸۸ء لکھا ہے جو درست نہیں، اودھ اخبار'' لکھنو مورخہ ۲۱ فروری ۱۸۶۵ء کے شمارہ (ص ۱۴۵) سے پتہ چلتا ہے کہ اشک نے ۱۸۲۵ء۔۸۲۷ھ میں وفات پائی تھی۔

اشک کے احوال وکوائف مندرجہ مصادر میں موجود ہیں:

اردوی معلیٰ (حصہ اول) ص ۱۶۴

اردوی معلیٰ (صدی اڈیشن) حصہ دوم

بزم سخن۔ نواب سید علی حسن خاں سلیم، ص ۱۴

تحقیقی نوادر۔ ڈاکٹر اکبر حیدری ص ۳۸۹

خمخانۂ جاوید (جلد اول) لالہ سری رام ص ۳۱۳ سخن شعرا، عبدالغفور نساخ بص ص ۳۰ تا ۳۱

تپش بنشی غلام محمد خان دہلوی، اودھ اخبار کے مدیر اور اخبار مشیر قیصر ہند کے مالک تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ رسالہ تعمیر ہریانہ کے نول کشور نمبر (ص ۷۶ نیز ص ۸۷) میں منشی محمد خال تپش کا نام ایک جگہ منشی غلام بخش تپش اور دوسری جگہ منشی غلام احمد تپش درج ہے۔ اسی طرح فروغ اردو لکھنو کے نول کشور نمبر (ص ۳۳) میں تپش کا نام منشی غلام بخش تحریر ہوا ہے۔ یہ تمام اندراج نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ تپش کا صحیح نام غلام محمد خاں تھا جس کی تائید ارمغان، طبع (۱۸۷۷ء) آب بقا تلاندہ غالب خم خانہ جاوید وغیرہ سے ہو جاتی ہے جیسا کہ صفحات گذشتہ میں عرض کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے مطالعہ امیر میں تپش کے اس مسلسل مضمون کا ذکر تک نہیں کیا ہے جس میں انہوں نے مشیر قیصر ہند کے متعدد شماروں میں امیر اللغات کے اغلاط کی نشان دہی کی ہے جب کہ دوسرے مصادر میں اس کا ذکر موجود ہے۔

ڈاکٹر کاظم علی خاں تپش کے سلسلہ میں یوں گویا ہیں "" لالہ سری رام کا بیان ہے کہ تپش نے ۱۸۹۰ء کے قریب وفات پائی۔ مگر آب بقاء میں تپش کا سنہ وفات ۱۳۲۰ (۱۹۰۳-۱۹۰۲ء) قرار دیا گیا ہے۔ ''خم خانہ جاوید آب بقاء تلامذہ غالب میں تپش کے جو حالات درج ہیں ان پر راقم الحروف نے مندرجہ ذیل اضافے کئے ہیں۔

(1) میری اطلاع لاع کے مطابق سرسید احمد خاں، غلام محمد خاں تپش (مدیر اخبار اودھ) لکھنو کے مکتوب الیہ تھے مجھے سرسید کے نام منشی غلام محمد خاں کا جو اردو خط ملا ہے اس سے کئی امور کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) غلام محمد خاں تپش کے نام سرسید بھی خط لکھا کرتے تھے گویا غلام محمد خاں سرسید کے مکتوب الیہ ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ (۳) تپش ایک اچھے مضمون نگار تھے اور سرسید کے تہذیب الاخلاق تپش کے مضمون کو جگہ ملتی تھی۔
(۴) مجھے عبدالغفور نساخ کے اردو دیوان ارمغان (طبع ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء) میں منشی غلام محمد خاں تپش کا مندرجہ ذیل فارسی قطعہ تاریخ بھی ملا ہے:

چو شد طبع دیوان ثالث به اردو

از آنجا که هست از کمالات نساخ

مسلم شده در جهاں فضل قائل

بگفتم کمالات نساخ کامل

۱۲۹۴

رک تم خانہ جاوید (جلد دوم) لالہ سری رام ص ۳۵

آب بقا خواجہ (عبدالروؤف) عشرت ص ۱۷۰

تلاندہ غالب مالک رام (طبع اول) ص ۹۵

سلکھ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز ص ۱۶۹ تا ۱۷۰

ارمغان نساخ ص ۱۲۵

غالب کے دوستوں میں نواب فخر الدین خان متخلص بہ خود بھی تھے جو نواب شرف الدین کے بیٹے تھے، یہ شیفتہ اور نیر کے بھی دوست تھے۔ شاعری کے علاوہ ان کو کتابت کا بھی ذوق تھا۔ ان کی کتابت عموما اغلاط سے پاک ہوتی تھی ڈاکٹر کاظم علی خاں نے ان کے بارے میں لکھتے ہیں: نواب فخر الدین خاں خرد کے حالات مندرجہ ذیل مصادر میں لکھتے ہیں موجود ہیں (۱۵)

بزم سخن۔نواب سید علی حسن خاں سلیم ص ۴۴ مملوکہ کاظم علی خاں

خم خانہ جاوید (جلد سوم) لالہ سری رام ص ۱۲

سخن شعراء (عبدالغفور) نساخ ص ۱۴۸

گلستان بے خزاں (قطب الدین) باطن ص ۲۷۹

گلشن بے خار نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (وحسرتی) ص ۶۵ (مملوکہ کاظم علی خاں)

مرکاتیب غالب (امتیاز علی خاں عرشی) دیباچہ ص ۲۳ حاشیہ

ان کے علاوہ مردان علی خاں رعنا اور غلام حسنین قدر بلگرامی کے سلسلہ میں بہت کارآمد اطلاعات اس مضمون میں ملتی ہیں۔

ڈاکٹر کاظم علی خاں کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ وہ اہم مصادر کے تعلق سے یہ اطلاعات فراہم کرتے ہیں کہ وہ کہاں سے دستیاب ہوسکتا ہے ان کے ذاتی ذخیرے میں جو اہم کتابیں ہیں ان کی نشان دہی بھی کردیتے ہیں۔(۱۶)

بہر حال تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی ہے نئے نئے مصادر کشف ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی وہم وگمان و قیاس حق الیقین کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور کبھی مفروضہ کلیہ ریت کا محل ثابت ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنے مقالات میں مشکل الفاظ کے معانی بھی تحریر کئے ہیں اور اس شان سے کہ لغت کا صفحہ نمبر، لغت نگار کا نام، مقام اشاعت، سال اشاعت اور اڈیشن وغیرہ سب کی صراحت ہوتی ہے۔ وہ تحقیق میں سماں باندھنے یا ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ نہ ہی کسی محقق یا ادیب کے لئے تضحیک آمیز جملہ لکھتے ہیں مثلاً ''یہ از روئے تقویم درست نہیں یا اس میں اشعار کی تعداد اتنی ہے "یا" یہاں پر ان سے سہو ہوا ہے یا" مجھے ان کی کمیاب نثر کا نمونہ بھی ملا ہے یا انہوں نے غالب کا فلاں خط تلاش کیا وغیرہ وغیرہ جن میں دوسروں کے کاموں کا اعتراف بھی ملتا ہے اور ان کی کمیوں کی اطلاع بھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی تلاش و تحقیق کے نتائج بھی بغیر کسی احساس تفاخر کے اس انداز میں بیان کردیتے ہیں کہ عام قاری مطمئن ہو اور خواص محظوظ۔

حسن ختام کے طور پر یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اپنی تحریروں میں نہ تو حقائق سے چشم پوشی کی اور نہ ہی دن کو رات تسلیم کیا یہ ان کا ہی جگر تھا کہ دبیر کے محاسن کرنے میں وہ انیس کے فضائل فراموش نہیں کرتے تھے۔ غالب کے بارے میں یہ کہنے کی جرات رکھتے تھے کہ یہ ان کی قتیل دشمنی تھی۔ دلی کے اندر وہ لکھنو والوں کی میر نوازی کی داستان بیان کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ باتیں بہت ہیں مگر میں کہہ بات ختم کرتا ہوں:

قیاس کن به این گلشن مرا بهار مرا

ڈاکٹر کاظم علی خاں مرحوم کے اس مقالہ میں بعض امور توضیح طلب ہیں بخوف طوالت صرف چند اہم ترین چیزوں پر صرف قارئین کے معلومات کی خاطر اضافے کئے جا رہے ہیں اصل مقالہ میں کوئی نقص نہیں ہے۔ غلام حسنین متخلص بہ قدر بلگرامی کی غالب اور نول کشور سے گہری وابستگی تھی اور غالب نے مطبع میں ملازمت کے لئے سلسلہ جنبانی بھی کی تھی، قدر کا نام مقالہ میں متعدد جگہ غلام حسین ملتا ہے جو پہلی نظر میں سہو کتابت لگتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ غلام حسنین قدر کا تاریخی نام ہے جو ان کے چچا نے تجویز کیا تھا، اس سے ۱۲۴۹ھ برآمد ہوتا ہے جو قدر کا ہجری سنہ ولادت ہے۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نے قدر کی ایک تصویر بھی مقالہ کے ساتھ شائع کرائی تھی جس کا عکس بھی اس مضمون کے آخر میں شامل ہے۔ قدر نے نول کشور کے مطبع سے علحدگی کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اپنایا تھا۔ ان کی فارسی دانی کی مہارت سن کر کیننگ کالج (موجودہ لکھنو یونیورسٹی) کے ارباب حل وعقد نے ان کو فارسی تدریس کے لئے مامور کیا۔ ۱۸۷۷ء میں قدر بلگرامی نے کالج کی تاسیس کے مبارک موقع پر پندرہ اشعار پر مبنی قطعہ تاریخ کہا جس کے ہر مصرعہ سے ۱۸۷۷ء کا عدد برآمد ہوتا ہے۔ یہ تاریخی کتبہ لکھنو یونیورسٹی کے بلند و بالا

°مالویہ ہال کے داخلی دروازے پر مغرب جانب نہایت عمدہ سفید سنگ مرمر پر جلی حروف میں کندہ تھا ۲۰۲۲ء میں ہال کی تزئین کاری کے موقع پر شکستہ ہونے کے باعث اسے ہٹا کر دوسرے پتھر پر کندہ کرا کر نصب کر دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کی اس تاریخی یادگار کا عکس بھی شامل اشاعت ہے جس کا سلسلہ قدر بلگرامی کے توسط سے غالب تک پہنچتا ہے، جن کی وفات کے آٹھ برس بعد ان کے شاگرد کا یہ کتبہ ایک مؤقر علمی ادارہ کی زینت بنا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس وقت کے متحدہ صوبہ جات آگرہ اودھ کے گورنر لارنس نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ پہلا اور آخری شعر ملاحظہ ہو:

گورنر جنرل عالی روش لارنس صاحب نے
بہ جد وجہد کل اٹھارہ سو سٹھ نومبر میں ۱۸۸
مکمل نظم وہ لکھی ہے قدر بلگرامی نے
ہیں سال عیسوی مقصود ہر اک مصرع تر میں

۱۸۲۲ء میں انگریزی حکومت کے پہلے وائسرائے چارلس جان کیٹنگ نے لندن میں وفات پائی ان کی یاد میں اودھ کے تعلقداروں نے ایک علمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا اور ۱۸۷۳ء میں خیالی گنج امین آباد کی تنگ گلیوں میں کیٹنگ ہائی اسکول کا ۲۰۰ طالب علموں سے آغاز ہوا مختلف عمارتوں میں تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے بالآخر ۱۳ نومبر ۱۸۶۷ء کو دوسرے وانسر کے سر جان لارنس نے اس کالج کی بنیاد رکھی اور ۱۵ نومبر ۱۹۷۸ء کو سر جارج کو پرانٹٹ گورنر صوبہ جات شمال مغرب اور چیف کمشنر اودھ نے اس عمارت کا افتتاح کیا آگے چل کر یہ لکھنو یونیوسٹی کے نام سے موسوم ہوئی اور ۱۲، دسمبر ۱۹۲۰ء جی این چکرورتی اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے، جولائی ۱۹۲۱ء سے تعلیمی سیشن کا آغاز ہوا اور اکتوبر ۱۹۲۳ء میں پہلا جلسہ تقسیم منعقد ہوا۔(Cnovocation) اسناد کاظم علی خاں نے لکھا کہ کلیات غالب طبع ۱۸۷۲ء کا جو نسخہ ان کے پاس ہے وہ مشہور شاعر اور (ادیب) مہدی ناصری صاحب کی ملکیت میں رہا ہے اور اس کے سرورق اور متعدد صفحات پر ان کی تحریریں ہیں۔ اس میں یہ اضافہ ضروری ہے کہ ناصری شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ ادیب بھی تھے اور انہوں نے شبلی کی شعر العجم سے متاثر ہو کر فارسی ادب کی تاریخ مضادیہ عجم کے نام سے لکھی ہے جو اپنے محتویات کی بنا پر مدارس اور دانشگاہوں کے طلباء کے لئے بہت مفید ہے۔ صنادید محم'' پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں شانتی پریس اللہ آباد سے شائع ہوئی۔ راقم سطور نے خود اس کے چار اڈیشن علی الترتیب ۳ روپئے ۴۰، روپئے، پندرہ روپئے اور ۲۵ روپے میں خریدے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف اور لسان القوم حضرت صفی لکھنوی کے فارسی قطعات تاریخ درج ہیں۔

ایک لفظ کے معنی کے سلسلہ میں غیاث اللغات کا حوالہ دیتے ہوئے خاں صاحب نے طبع نومبر ۱۸۷۳ تحریر کیا ہے۔ غیاث الدین عزت رام پوری کی اس مشہور لغت کا بہ ترتیب زمانی تینتیسواں اور مطبع نول کشور میں شائع پانچواں اڈیشن ہے، جو مطبع کی کانپور کی شاخ سے ۱۸۷۳ء/ ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں صفحات کی تعداد ۵۱۸ ہے۔

قاضی محمد صادق اختر منگلوی کے والد کا نام قاضی محمد لحل تھا۔ اختر ان کا تاریخی نام ہے جس ۲۰۱، برآمد ہوتا ہے اور اس کی تصدیق

متعدد مستند مصادر سے ہوتی ہے،اردو اور فارسی کے بیشتر تذکرہ نگاروں نے ان کے نام کے ساتھ خان کا لاحقہ لگایا ہے جس کی وجہ سہل انگاری ہے۔قاضی عبدالودود نے ابن امین اللہ طوفان کے تذکرۃ الشعراء کے حواشی میں مستند مصادر کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے۔آزاد کے آب حیات میں ان کو حاجی بھی لکھا ہے جو سراسر غلط ہے۔خاں صاحب نے بھی ایک جگہ خان کا اضافہ کیا لیکن حواشی اور تعلیقات میں محمد صادق اختر لکھا ہے۔ہوسکتا ہے کہ یہ سہو کاتب ہو۔

حواشی وتعلیقات:

(۱) نیادور نول کشور نمبر نومبر۔دسمبر ۱۹۸۰ء،ص ۱۳۶ تا ۱۵۴

(۲) کلیات نثر غالب (مطبع نول کشور کانپور،اپریل ۱۸۸۸ء) ص ۲۵۳ تا ۲۵۴

(۳) نول کشور نمبر (مضمون غالب اور منشی نول کشور) ص ۱۳۶

(۴) ایضا-ص ۱۵۰

(۵) باغ دو در مرتبہ وزیرالحسن عابدی میں یہ قصیدہ اس ۴۷ تا ۴۹ پر محیط ہے۔لارڈ الگن ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کے دوسرے وائسرائے تھے جو پنجاب کی گورنری سے ترقی پا کر وائسرائے قلمرو ہند کے عہدہ پر فائز ہوئے۔جنوری ۱۸۶۳ء سے ۲۰ نومبر ۱۸۷۳ء تک برسرکار رہنے کے بعد اکاون برس کی عمر میں فوت ہوئے۔باغ دودر ص ۸۱ سطر ۵ پر مکتوب غالب سوا میں ایک جملہ ملتا ہے جو حل نظر ہے جان من دیروز کہ دوشنبہ ۱۲ دسمبر و روز عید نصارا بود،کرسمس یا بڑا دن ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا ہے ابھی تک ۲۲ دسمبر کی کم از کم مجھے تو خبر نہیں ہے۔غالب کا یہ خط میر احمد حسین میکش دہلوی ولد میر کرار حسین کو لکھا گیا ہے جن کے حالات اردوئے معلیٰ ص ۱۲۸،تلامذہ غالب ص ۲۶۷،روز روشن ص ۲۹-۲۲۸ گلستان سخن ص ۴۴۹۱ و رنگارستان ص ۱۴،وغیرہ میں ملتے ہیں۔

(۶) محولہ بالا مقالہ میں ڈاکٹر کاظم علی خاں نے یوسف علی خاں عزیز کے بارے میں اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔

(۷) صباح الدین عمر اتر پردیش اردو اکادمی کے پہلے سکریٹری اور معروف ادیب وشاعر تھے۔

(۸) ملاحظہ ہو حوالہ ہے

(۹) مضمون غالب اور منشی نول کشور،ص ۱۵۰

(۱۰) ایضا ص ۱۵۲ (تفصیل کے ملاحظہ ہو انتخاب دیوان قدر بلگرامی مرتبہ نسیم خاں نظامی پریس لکھنو ۱۹۸۳،تعداد صفحات ۱۶۵)

(۱۱) ایضاً ص ۱۵۳

(۱۲) غالب کے بعض غیر معروف ادبی آثار کاظم علی خاں،نیادور لکھنو،جولائی ۱۹۸۰ ص ۱۲ تا ۱۳

(۱۳) مضمون غالب اور منشی نول کشور پس ۱۵۰

(۱۴) ایضاً ص ۱۵۲ تا ۱۵۳

(۱۵)ایضاً ص۱۵۲

(۱۶)ان کی تفصیل بخوف طوالت نہیں دی جارہی ہے

کتابیات:

۱۔آب بقا۔خواجہ عبدالروؤف عشرت

۲-آثار غالب ۔قاضی عبدالودود

۳۔ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری ادارہ فروغ اردو لکھنو طبع ۱۹۷۰ء

۴۔اردوئے معلٰی (صدی ایڈیشن) حصہ اول دوم،مرتضیٰ حسین فاضل مجلس ترقی ادب لاہور طبع ۱۹۶۹ء

۵-ارمغان-طبع ۱۸۷۶/۱۲۹۴ھ

۶۔امیراللہ تسلیم حیات اور شاعری،ڈاکٹر فضل امام،اسرار کریمی پریس الہ آباد طبع ۱۹۷۴ء

۷۔باغ دودر مرتبہ وزیرالحسن عابدی،پنجابی ادبی اکیڈمی پریس لاہور ۱۹۶۷ء

۸-بزم سخن ۔نواب میر علی حسن خاں تسلیم عابدی مطبع مفید عام آگرطبع ۱۸۸۱ء(کاظم علی خاں)

۹۔پنج آہنگ،مرتبہ سید وزیرالحسن عابدی مطبع عالیہ لاہور طبع ۱۹۶۹ء

۱۰۔تحقیقی نوادر ڈاکٹر اکبر حیدری اردو پبلشر

۱۱۔تقویم یک صد دو سالہ مطبع منشی نول کشور لکھنو طبع ۱۸۶۵(مملوکہ رضا لائبریری،رام پور)

۱۲-خیابان غالب،نادم سیتاپوری،مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی طبع اپریل ۱۹۷۰ء

۱۳۔خم خانہ جاوید(جلد سوم)لالہ سری رام،دلی پرنٹنگ ورکس دہلی طبع ۱۹۱۷ء رجلد اول مطبع منشی نول کشور

۱۴۔دعای صباح(غالب)مرتبہ کالی داس گپتا رضا،دل پبلی کیشنز،بمبئی طبع دسمبر ۱۹۸۷ء

۱۵-دستنبو،۱۸۵۷ء

۱۶۔سراپا سوز(محمد صادق اختر)مرتبہ پروفیسر نو احسن ہاشمی

۱۷۔سخن شعرا(عبدالغفور نساخ)مطبع منشی نول کشور لکھنو طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء

۱۸۔غالب،مولانا غلام رسول مہر،لاہور پریس دہلی،سنہ اشاعت ندارد

۱۹۔سکنڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز طبع ۱۹۶۲ء

۲۰۔غالب اور ذکا،ضیاء الدین شکیب،غالب اکیڈمی نئی دہلی طبع فروری ۱۹۷۲ء

۲۱۔غالب اور شاہان تیموریہ،ڈاکٹر خلیق انجم،مکتبہ جامعہ دہلی طبع دسمبر ۱۹۷۴ء

۲۲۔غالب بلوگرافی ،مرتبہ محمد انصا اللہ علی گڑھ طبع ۱۹۷۲ء

۲۳۔غالب نام آورم، نادم سیتا پوری، سرفراز پریس لکھنو طبع ۱۹۶۹ء

۲۴۔غالب کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، مکتبہ شاہراہ دہلی طبع فروری ۱۹۶۱ء

۲۵۔غیاث اللغات، غیاث الدین عزت رام پوری مطبع نول کشور کانپور طبع نومبر ۱۸۷۳ء، چاپ پنجم ص ۵۱۸

۲۶۔فرہنگ آصفیہ (جلد چہارم) سید احمد دہلوی، ترقی اردو بورڈ دہلی طبع ۱۹۷۴ء

۲۷۔قاطع برہان، مرزا غالب، مطبع منشی نول کشور لکھنو، طبع ۱۲۷۸ھ

۲۸۔کلیات غالب (نظم) مطبع منشی نول کشور لکھنو طبع ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء

۲۹۔کلیات نثر غالب مطبع منشی نول کشور کانپور طبع ۱۸۹۷ء

۳۰۔گلشن بے خار (تذکرہ) نواب مصطفیٰ خاں حسرتی وشیفتہ مطبع نول کشور لکھنو طبع جون ۱۸۷۵ء (مملوکہ کاظم علی خاں)

۳۱۔گلستان بے خزاں (تذکرہ) قطب الدین باطن مطبع منشی نول کشور لکھنو طبع جون ۱۸۷۵ء

۳۲۔مطالعہ امیر، ڈاکٹر ابو محمد سحر نسیم بک ڈپو لکھنو طبع مئی ۱۹۶۵ء (پی۔ایچ۔ڈی مقالہ)

۳۳۔مکاتیب غالب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ناظم پریس، رام پور طبع ۱۹۴۲ء

۳۴۔منتخب اللغات، مولانا عبدالرشید الیمینی المدنی مطبع احمدی، کانپور طبع ۱۸۸۷ء

۳۵۔مثنوی شعاع مہر، مرزا حاتم علی مہر، مطبع حیدری آگرہ، مطبوعہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۰ء

۳۶۔میلیم تاریخ طبع دسمبر ۱۹۱۲ء

۳۷۔مہر نیم روز، مطبوعہ ۱۸۵۱ء

۳۸۔ہنگامۂ دل آشوب، مرتبہ سید قدرت نقوی، انجمن ترقی اردو کراچی طبع ۱۹۶۹ء

۳۹۔یادگار غالب، مولانا حالی، شانتی پریس الہ آباد، طبع ۱۹۵۸ء

رسائل:

۱۔ای تعمیر ہریانہ۔نول کشور نمبر

۲۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔علی گڑھ میگزین، غالب نمبر (۱۹۴۹-۱۹۴۸)

۴۔غالب نامہ نئی دہلی جلد اول، شمارہ (۳۴)

۵۔فروغ اردو۔لکھنو

۶۔نگار۔رام پور
۷۔نیادور۔لکھنؤ

☆☆☆

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید
ڈائیریکٹر مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

برہمن زادۂ رمز آشنائے رُوم

عہد ساز اور عصر آفریں شخصیتیں طول وطویل مدت کے بعد ہی مشیمۂ فطرت سے معرض وجود میں آتی ہیں اور اقبال بھی ان ہی عبقری اور نابغہ روزگار افراد میں سے ایک ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے ہندوستان کو اپنے افکار سے کچھ اس طرح متاثر کیا کہ رہتی دنیا تک انھیں عظیم مفکرین کے زمرے میں شمار کیا جاتا رہے گا اور ان کے فلسفیانہ افکار کی شروح وتفاسیر لکھی جاتی رہیں گی۔

اقبال کو مذاق سخن سنجی عہد طفلی سے ہی ودیعت ہوا تھا اور وہ اردو زبان میں نغمہ سرائی کرتے تھے لیکن مدت عمر کے وسط میں پہنچنے کے بعد انھوں نے جریدۂ عالم پر اپنے ثبت دوام کے لیے فارسی شاعری کو اپنی جولانگاہ بنایا۔ انھیں ہندی نژاد ہونے کی بنا پر فارسی سے اپنی بیگانگی اور تہی پیمانگی کا احساس ہے اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوی شیرینیت وحلاوت میں شکر مانند ہے لیکن فارسی کی عذوبت وچاشنی بے مثال ہے، جس کے حسن دل افروز نے میری فکر کے سراپا کو اپنے طلسم کا فریفتہ کر ڈالا۔ چنانچہ اسرار خودی کی تمہید میں اقبال کہتے ہیں:

...هندیم از پارسی بیگانه ام ماه نو باشم تهی پیمانه ام...
گرچه هندی در عذوبت شکر است طرز گفتار دری شیرین تر است
فکر من از جلوه اش مسحور گشت خامۂ من شاخ نخل طور گشت ...

(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص۹۰)

ہر بڑے ادیب، شاعر یا مصلح کے افکار خود اس کے عہد کی معاشرت، حالات اور گوناگوں اوضاع کی پیداوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اقبال نے چشم شعور کھولی تو اس وقت نہ صرف یہ کہ ہندوستان بلکہ سارے عالم میں مسلمانوں کی زبوں حالی، دون ہمتی اور علمی ومعاشی پستی نقطہ انتہا پر تھی۔ برطانوی استعمار کے سامنے درخشاں ماضی رکھنے والی قوم مسلم پسپا تھی، اخلاقیات کا فقدان تھا اور خلوص وللّٰہیت کی کمی نے سریر سلطنت وپیشوائی سے اٹھا کر انھیں ذلت ورسوائی کے قعر عمیق میں ڈھکیل دیا تھا۔ ملت اسلامیہ کا یہ حشر جنت کشمیر کی خاک سے مرکب جسم، حجازی دل اور نوائے شیرازی رکھنے والے اقبال کے لیے سوہان روح ثابت ہوا جس نے انھیں مداوا کے تلاش کی طرف مائل کیا اور نباض فطرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اقبال نے قوم کے مرض کی تشخیص کی اور حذاقت طبع سے شفا کے راستے تلاشے۔ اس تلاش وجستجو میں پیر روم نے اقبال کی کچھ اس طرح رہنمائی کی کہ یہ برہمن زادہ آشنائے راز بن گیا۔ چنانچہ خود اقبال کے بقول:

میرومرزا به سیاست دل و دین باخته اند

جز برهمن پسری محرم اسرار کجاست

اور زبورِ عجم میں تو اقبال نے یہاں تک کہہ ڈالا:

مرا بنگر که در هندوستان دیگر نمی بینی

برهمن زادهٔ رمز آشنای روم و تبریز است

(کلیاتِ اشعار فارسی اقبال، ص ۴۷)

شاعرِ فردا کی فارسی شاعری کا سفر مثنوی اسرارِ خودی سے شروع ہوتا ہے جو اپنی وقعت و اہمیت اور افکار کی جولانی کی بنا پر خاصی مطبوع و مقبول ہے۔اقبال نے خمخانۂ مولوی سے ہی کشید کر کے اپنے افکار کی شراب کو دو آتشہ بنایا ہے اور ان کی یہ لعلِ آتشیں، بادہ عنب سے زیادہ برنا اور سرور انگیز ہے۔

اقبال عہدِ طفلی سے ہی مولانا روم کے دلباختہ و شیدا رہے ہیں لہٰذا مولانا سے اس شدت کی مودت قلبی اور ربط روحانی فطری تھا اور مولوی سے اقبال کی یہ فریفتگی ان کے تمام کلام میں بہت نمایاں اور مبرہن ہے۔گویا اقبال نے مولانا روم کو ایسا مرشد ذی مرتبت بنالیا تھا کہ جس سے وہ اپنے اس سفر عرفان اور سیر سلوک میں ہر ہر قدم پر رہبری و رہنمائی حاصل کرتے اور استمداد طلب کرتے تھے۔مولانا، اقبال کی نگاہ میں وہ روشن ضمیر مرشد ہیں جنھیں کاروان عشق و مستی کی امارت حاصل ہے، جن کی منزل جہان خور و ماہ سے آگے ہے، جن کے خیمے کی طنابیں کہکشاں سے مرکب ہیں، جن کا سینۂ صافی نور قرآنی کی تابش سے ایسا شفاف و مجلی آئینہ ہے کہ جس کے سامنے جام جمشید بھی بے حیثیت ہے۔اسی نے نواز پاک نژاد مرشد نے اقبال کے وجود میں شور و جنون کا سرمایہ بھر دیا۔چنانچہ اقبال مثنوی ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' کی تمہید میں کہتے ہیں:

پیر رومی مرشد روشن ضمیر — کاروان عشق و مستی را امیر

منزلش برتر ز ماه و آفتاب — خیمه را از کهکشان سازد طناب

نور قران درمیان سینه اش — جام جم شرمنده از آئینه اش

از نی آن نی نواز پاك زاد — باز شوری در نهاد من فتاد

گفت جانها محرم اسرار شد — خاور از خواب گران بیدار شد

جذبه های تازه او را داده اند — بند های کهنه را بگشاده اند...

(کلیاتِ اشعار فارسی اقبال، ص ۷۵-۷۴۴)

اقبال نے مولوی معنوی سے اپنی شیفتگی اور عقیدت و ارتباط کا اس حد تک لحاظ رکھا کہ انھوں نے اپنی بیشتر مثنویوں کے لیے مثنوی مولانا روم کی ہی بحر رمل مسدس محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) کو منتخب کیا اور اپنی مثنویوں میں اپنے نظریہ و افکار کی صحت و استناد کے طور پر جا

بجا مولانا کے اشعار بھی شامل کیے۔اقبال مولانا کے ہم نوا ہیں اور اسی عقائد و افکار کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں جو مولانا نے اپنے اشعار کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو دیئے تھے۔ارمغان حجاز میں اقبال کہتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذان من
ازو آموختم اسرار جان من

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۴۳۶)

اقبال نے جا بجا مولانا روم کے خمخانۂ افکار سے اپنی قدح پیمائی کا اعتراف کیا ہے اور اپنے قاری کو تشویق دلائی ہے کہ تم بھی وہی کہنہ شراب پیو جس کا ایک جام سلطنت پرویز سے زیادہ گراں قدر ہے اور اپنے حریم دل کی دیواروں کو جلال الدین رومی کے اشعار کے طغروں سے مزین کرو۔یہ لالہ رنگ ساغر وہ ہے جو پتھر کو بھی لعل گرانمایہ بنا دیتا ہے اور ہرن کو بھی اسد ہمت کر دیتا ہے۔میں نے اسی پیر روم کے تب و تاب سے خوشہ چینی کی ہے۔میری راتیں اسی نجم ثاقب کے نور سے روشن ہیں اور مولانا کے فیض نے ہی میری فکر کو اعتبار بخشا ہے۔چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

بکام خود دگر آن کهنه مئی ریز   که باجامش نیرزد ملك پرویز
ز اشعار جلال الدین رومی   به دیوار حریم دل بیاویز

(کلیات اشعار فارسی اقبال: ص ۴۴۳)

بگیر از ساغرش آن لاله رنگی   که تاثیرش دهد لعلی به سنگی
غزالی را دل شیری به بخشد   بشوید داغ از پشت پلنگی

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۴۴۳)

مولانا کے افکار و عقائد کو اقبال ماہ و انجم کا ہم نشین بتاتے ہیں اور پروین ان کا ہدف ہے۔وہ فقیر رومی سے اس فقر کے حصول کی تشویق دلاتے ہیں کہ جو تونگری و امارت کا محسود ہے:

زرومی گیر اسرار فقیری   که آن فقر است محسود امیری
حذر زان فقر و درویشی که ازوی   رسیدی بر مقام سر بزیری

....

...زچشم مست رومی وام کردم   سروری از مقام کبریایی

....

می روشن ز تاك من فرو ریخت   خوشا مردی که در دامانم آویخت...

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص۴۴۴)

مثنوی اسرار خودی میں اقبال نے خودی کو زندگی کا محور اور نقطہ ارتکاز قرار دیا ہے، جو جہان ہستی ہے، جو بذات خود قائم ہے اور جو شوؤنات زندگی کی بقاء کی ضامن ہے۔ اقبال کی خودی ایک ایسی حقیقت ہے جو فرد کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ یہ کوئی واہمی یا تخیلی شئے نہیں ایک فعلیت ہے جس کے اوصاف بے حد وانتہا ہیں۔ اس مثنوی کی تمہید میں اقبال نے مولانا روم سے اپنے استفاضے کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں پھر اس پیر روم کے فیض سے اسرار علوم کے سربستہ دفاتر پڑھ رہا ہوں، جس کی روح شعلۂ ادراک وعرفان سے سرمایہ دار ہے ۔جس نے اس خاک کو اکسیر بنایا ہے اور جس نے اس غبار سے جلوے تعمیر کیے ہیں۔ میں وہ موج ہوں جس نے اس پیر روم کے بحر افکار میں شناوری کی ہے تا کہ وہ دررولآ لی حاصل کروں جو تابندگی میں لاثانی ہیں:

باز برخوانم ز فیض پیر روم — دفتر سربسته اسرار علوم
جان او از شعله ها سرمایه دار — من فروغ يك نفس مثل شرار
شمع سوزان تاخت بر پروانه ام — باده شبخون ریخت بر پیمانه ام
پیر رومی خاك را اكسير كرد — از غبارم جلوه ها تعمير كرد...
موجم و در بحر او منزل كنم — تا در تابنده ای حاصل كنم
من كه مستی ها ز صهبایش كنم — زندگانی از نفس هایش كنم

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص۸۸)

اسرار خودی کی اس تمہید میں اقبال بیان کرتے ہیں کہ ایک رات میرا دل مائل فریاد تھا اور میری خاموشی، حسرت ودرد میں ڈوبی ہوئی میری یارب کی آواز سے آباد تھی، میں آشوب غم ایام کی شکوہ سنجی کر رہا تھا اور اپنی تہی پیمانگی پر نالاں تھا کہ مجھ پر نیند غالب ہوئی اور اس پیرحق سرشت نے کہ جس نے زبان پہلوی میں قرآن لکھا ہے اپنے جمال عشوہ ساز سے مجھے فیروزمند کیا اور دیوانۂ ارباب عشق کے تخاطب کے ساتھ مجھے شراب ناب عشق سے جرعہ گیری کی تشویق دلائی۔ اقبال کہتے ہیں:

...روی خود بنمود پیر حق سرشت — كو به حرف پهلوی قرآن نوشت
گفت ای دیوانۂ ارباب عشق — جرعه ای گیر از شراب ناب عشق
برجگر هنگامۂ محشر به زن — شیشه بر سر دیده بر نشتر به زن
خنده را سرمایۂ صد ناله ساز — اشك خونين را جگر پر گاله ساز
تابکی چون غنچه می باشی خموش — نكهت خودرا چو گل ارزان فروش...
آشنای لذت گفتار شو — ای درای كاروان بیدار شو...

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۸۹)

اقبال کا مولوی سے جذبہ تعشق کس انتہا کا ہے اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اپنی مثنویوں میں جا بجا اقبال نے مولانا کے تتبع میں ان کی ہی تراکیب اور اسی پیرائے میں اپنے افکار سموئے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں:

گفت معشوقی به عاشق کای فتی   تو به غربت دیده ای بس شهر ها
پس کدامین شهر زانها خوشتر است   گفت آن شهری که دروی دلبر است

(لوح فشردہ مثنوی مولوی معنوی، دفتر سوم، ص ۵۰۸)

اقبال نے اس کا تتبع کرتے ہوئے کہا:

خاك یثرب از دو عالم خوشتر است
ای خنك شهری که دروی دلبر است

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۹۵)

مولوی فرماتے ہیں:

آنچه شیران را کند روبه مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

اقبال، سوال کو بواعث ضعف خودی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ای فراهم کرده از شیران خراج
گشته ای روبه مزاج از احتیاج

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۹۵)

مولوی کی فکر کہ:

علم حق در علم صوفی گم شود
این سخن کی باور مردم شود

اقبال کے یہاں کچھ اس انداز سے جلوہ فگن نظر آتی ہے کہ:

در رضایش مرضی حق گم شود
"این سخن کی باور مردم شود"

(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۱۱۶)

رموز بیخودی اقبال کے فلسفہ خودی کی ہی تکمیل ہے۔ یہاں بھی ان کے افکار کو مولوی معنوی سے ہی رشد حاصل ہوا۔ اقبال نے اپنی اس مثنوی میں خودی سے آشنائی کا طریقہ بتایا ہے اور یہ درس دیا ہے کہ کس طرح افراد کو چاہیے کہ شوؤن ملت کی بقاء کے لیے اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کریں۔ اقبال کی نگاہ میں جامعہ اسلامی ہی ملت وقوم ہے نہ کہ حدود انسانی میں منقسم یہ خطہ ہای اراضی۔ یہ بیخودی دراصل اپنی خودی کو جامعۂ اسلامی میں محو اور فنا کر دینا ہے جو درحقیقت نفس کی تذہیب وتفضیض اور تزئین ونشو ونما ہے۔ کیوں کہ اس کے پس پشت نفس ملی وقومی اور جامعۂ اسلامی کی خودی کے فروغ کا جذبہ مضمر ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ اخوت اسلامی کا ایک خودمختار اور پرشکوہ معاشرہ اس جہاں میں متشکل ہو اور اس جامعۂ اخوت اسلامی کا ریشہ اور بیخ وبن عشق خدا اور حب رسول کے اجزاء پر قائم ہو۔ ۱۰۱۸/ابیات پر مشتمل رموز بیخودی اقبال کے فلسفہ خودی کا ہی استنتاج اور ماحصل ہے اور یہ مثنوی بھی لفظاً ومعناً مولانا روم کی اتباع اور ان کے افکار کے نور میں کہی گئی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کی رموز بیخودی خمخانۂ مولوی کے اسی شعر کی تشریح وتفسیر ہے جس میں مولوی فرماتے ہیں:

جهـد كـن در بيـخـودی خـود را بيـاب زود تـر و الـلـه اعـلـم بـالـصـواب

(لوح فشردہ مولوی معنوی، دفتر چہارم، ص۶۹۶)

تو بیجا نہ ہوگا۔ رموز بیخودی میں بھی اسرار خودی کی طرح پیر رومی کی وساطت سے اقبال کے پرشور وجان باختہ دل پر آسمان آبگون سے یم افکار کی طراوش ہوئی ہے جسے اقبال نے اپنی صناعی سے باریک نہروں کی شکل میں تبدیل کرکے ملت اسلامیہ کے صحن دل کے گلشن میں پہنچایا ہے کیوں کہ یہ ملت اسلامیہ اقبال کے محبوب کی محبوب ہے جو خود اپنی عظمت وفضیلت سے ناآشنا ہوگئی ہے اور جس کی حیات محکم کے، اقبال بارگاہ ایزدی سے طلب گار ہیں۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کے افراد کو بیخودی کے جن رموز واسرار سے آگاہ کرایا ہے اسے وہ مولانا ہی کی طرح تیغ فولاد سے زیادہ تراشندہ وبرندہ سمجھتے ہیں اور اپنے درمعنی ربط فرد وملت کی تمہید کا اختتام مولانائے روم کے اس شعر پر کرتے ہیں:

نكتـه هـا چـون تيغ پولاد است تيـز
گـر نـمـی فهـمـی ز پيـش مـا گـريـز

(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص۱۳۰)

ایسی مثالیں کثرت سے پیش کی جاسکتی ہیں جو اقبال کے تتبع مولانا کی سند ہیں اور جہاں اقبال نے مولانا سے استمزاج کرکے امت مرحوم کی شوؤن مافات کی بازیابی کے لیے سعی وجہد کی تشویق دلائی ہے۔ اقبال، مولوی سے اس حد تک متاثر ہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی ہے کہ:

...تـو مـگـر ذوق طـلـب از كف مـده گـرچـه در كـار تـو افتـد صد گـره
گـر نيـابـی صـحبـت مـرد خبيـر از اب و جـد، آنـچـه مـن دارم بـگيـر
پيـر رومـی را رفيـق راه سـاز تـا خـدا بـخشـد تـرا سـوز و گـداز

زانکـــه رومـــی مغــز را داند ز پوســت پــای او مــحکم فتد در کـوی دوست
(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص۴۱۹)

اقبال کی مولانا روم سے موانست قلبی اس حد تک ہے کہ وہ مطرب سے ان ہی کے اشعار اوران کی ہی غزلوں کی فرمائش کرتے ہیں تا کہ اپنی روح کو آتش تبریزی میں جلا کر کندن بنا سکیں۔ کہتے ہیں:

مـطرب غـزلـی بیتی از مرشد روم آور
تـاغـوطـه زنـد جـانم در آتـش تبریزی
(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص۲۴۹)

غزل گوئی میں بھی اقبال نے مولانا روم کی خوب خوب پیروی کی ہے اوران کی قندیلوں سے اپنی محافل غزل کی تابش وتنویر کا سامان کیا ہے۔لیکن اس صنف سخن میں ان کا منوچہری، ناصرخسرو، عراقی، سعدی شیرازی، خسرو دہلوی، حافظ، جامی، عرفی اور بیدل و غالب وغیرہ سے بھی تتبع نظر آتا ہے۔حب کہ مثنوی میں دوسرے اساتید کی موجودگی کے باوجود اقبال نے صرف پیرروم کو ہی اپنا مرشد تام بنایا ہے۔ بہر حال جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اقبال نے اس صنف سخن میں بھی مولانا کی جابجا تابعیت کی ہے اور اقبال کی متعدد غزلیں مولانا کی ہی بحور اور اسی اوزان وقوافی میں ملتی ہیں مزید یہ کہ اسی شور ومستی سے لبریز نظر آتی ہیں۔مولوی فرماتے ہیں:

مـن مســت و تـودیـوانــه مـارا کــه بـردخـانـه؟ مـن چـنـد تـرا گـفتم کـم خـور دو سه پیمانه
در شهــر یـکـی کـــس را هشیــار نـمی بینـم هــر یك بتــراز دیگـر شـوریـده و دیـوانــه
جــانـــان بـخـــرابـــات آ تـــا لـذت جـان بینــی جـان را چـه خـوشی باشد بی صحبت جانانه...
مــن بـی ســرو دستـــارم مـن سـوی تـو دسـت آرم یك سینـه سـخن دارم هین شرح کنم یانه...
(کلیات شمس تبریز:ص۷۳۷)

اقبال کہتے ہیں:

فـرقـی نـنهـد عـــاشـق در کـعبـه و بتـخـانــه ایـن جـلـوت جـانــانـه آن خلوت جـانـانـه
از بـزم جهـان خــوشتـر، از حـوروجـنـان خـوشتـر یك هـمـدم فـرزانــه وز بــاده و پیمـانـه...
ایــن کیســت کـــه بـر دلهــا آورده شبیـخـونـی صـد شهـر تـمـنــا را یـغـمـازده تر کـانـه...
(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص۲۵۰)

مولوی کی یہ مشہور ومعروف غزل کہ:

بنمای رخ که باغ و گلستانم آرزوست بگشای لب که قند فراوانم آرزوست
ای آفتاب رخ بنما از نقاب ابر کان چهرۂ مشعشع تابانم آرزوست
(کلیات شمس تبریز،ص ۱۷۱)

اقبال کے یہاں اسی ردیف لیکن حرف قید کے اختلاف کے ساتھ کچھ اس انداز میں ساحری کرتی نظر آتی ہے کہ:

تیرو سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست با من میا که مسلك شبیرم آرزوست
گفتند لب به بندو ز اسرار مامگو گفتم که خیر نعره ی تکبیرم آرزوست...
کو آن نگاه ناز که اول دلم ربود عمرت دراز باد همان تیرم آرزوست
(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۲۴۷)

مولانا کی رفعت پرواز کا یہ انداز کہ:

ای شادی آنروزی کز راه تو باز آیی در روزن جان تابی، چون ماه ز بالایی
زان ماه برافزایش آن فارغ از آرایش این فرش زمینی را چون عرش بیارایی...
تو آبی ومن جویم جزوصل تو کی جویم رونق نبود جورا چون آب نه بکشایی...
شمس الحق تبریزی آلود مرا هجرت جز عشق نبینی گر صد بار بیالایی
(کلیات شمس تبریز،ص ۸۰۶)

اقبال کے یہاں کچھ اس طرح عشوہ طرازیاں کرتا نظر آتا ہے کہ:

این گنبد مینائی، این پستی و بالائی درشد بدل عاشق، با این همه پهنایی
اسرار ازل جویی؟ برخود نظری واکن یکتایی و بسیاری، پهنائی و پیدایی...
عشق است و هزار افسون، حسن است هزار آئین نی من به شمار آیم، نی تو به شمار آیی ...
هم باخود و هم با او، هجران که وصال است این ای عقل! چه میگوئی، ای عشق چه فرمایی
(کلیات اشعار فارسی اقبال،ص ۲۵۰)

مولانا کی شورانگیزی وہمت رندانہ کہ:

ای یار مقام دل پیش آ و دمی کم زن زخمی که زنی برما مردانه و محکم زن
گر تخت نهی مارا برسینۂ دریا،نه وردار زنی مارا بر گنبد اعظم زن
ارواح موافق را شربت ده و دم دم ده اشباح منافق را درهم زن و برهم زن

اکسیر لدنی را بر خاطر جامد نه مخمور یتیمی را بر جام محرم زن...
(کلیات شمس تبریز، ص ۵۸۷)

اقبال کی فکر جنون انگیز سے کچھ یوں مترشح ہے:

بانشئهٔ درویشی در ساز و دمادم زن چون پخته شوی، خود را بر سلطنت جم زن
ای لالهٔ صحرایی تنها نتوانی سوخت این داغ جگر تابی برسینه ی آدم زن...
لخت دل پرخونی از دیده فروریزم لعلی ز بدخشانم بردار و بخاتم زن
(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص ۶۵)

اخگر عشق کے اضطراب نے مولانا کو اگر اس طرح اکسایا کہ:

پرده بردار ای حیات و جان جان افزای من غمگسار و همنشین و مونس شبهای من
ای شنیده وقت و بیوقت از وجود نالها ای فگنده آتشی در جملهٔ اجزای من
در صدای کوه افتد بانگ من چون بشنوی جفت گردد بانگ کُه با نعرهٔ هیهای من...
(کلیات شمس تبریز، ص ۶۴۵)

تو اسی التہاب عشق نے اقبال کو کچھ اس طرح مضطرب کر ڈالا کہ:

شعله در آغوش دارد عشق بی پروای من بر نخیزد يك شرار از حکمت نازای من
چون تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز قیس را لیلی همی نامند در صحرای من...
گردشی باید که گردون از ضمیر روزگار دوش من باز آرد اندر کسوت فردای من...
(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص ۲۵۶)

اقبال کے یہاں ایسے بھی اشعار بکثرت ہیں جو ہیئت ظاہری ونقوش صوری تو جداگانہ رکھتے ہیں لیکن باطنی ومعنوی گیرائی وافکار میں مولانا کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً تیغ عشق کے کشتگان کی ہمت مردانہ اور افق منتہائے سلوک پر ان کی شہبازی کی تصویر کشی کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ:

بزیر کنگرهٔ کبریاش مردانند فرشته صید و پیمبر شکار و یزدان گیر

اقبال طریقت عشق کے مبتدی کو اس جرأت رندانہ کی تشویق یوں دلاتے ہیں کہ:

دردشت جنون من جبریل زبون صیدی یزدان بکمند آور ای همت مردانه
(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص ۲۵۰)

مختصر یہ کہ اقبال جیسا پیر روم کا دلدادہ وشیفتہ غالباً دوسرا کوئی نہیں ملے گا جس نے پیر روم کے خمخانہ معرفت وعشق سے اس کثرت کے ساتھ جرعہ نوشی کی ہو۔ واقعی یہ مولانا کا ہی فیضان نظر تھا جس نے اقبال کو ایسا وجدان اور شعور عطا کیا جس نے ان کے ذہن کے منصۂ شہود پر ان کے افکار ابکار کی عروس زیبا کو کچھ ایسے تجمل شاہانہ کے ساتھ مسند نشین کیا کہ جس کی بناء پر اقبال نے اپنے نغموں سے عجم کی برنائی لوٹانے کا دعویٰ کر ڈالا، جس نے عجم میں نئی روح پھونک دی اور جس کے نغمے کاروان ملت کے لیے وہ صدائے درا ثابت ہوئے جنھوں نے کاروان گم گشتہ کو راہ راست کی نشاندہی کی۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

عجم از نغمه های من جوان شد — ز سودایم متاع او گران شد
هجومی بود ره گم کرده در دشت — ز آواز درایم کاروان شد

(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص۲۱۲)

اور۔

عجم از نغمه ام آتش بجان است — صدای من صدای کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی — که ره خوابیده و محمل گران است

(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص۲۱۲)

اقبالؔ کے نغموں کی یہ طلسماتی کیفیت یقیناً مولانا روم کی رہین منت ہے جس کی تکریم وتمجید اور تحسین وستائش اور جس کا اعتراف اقبال کے کلام میں ہر طرف بکھرا نظر آتا ہے بلکہ ایک جگہ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے اقبال نے، صاحب نے کی نے نوازی، سے اپنی گرہ کشائی کا تشکر وامتنان ان الفاظ میں کیا ہے:

گره از کار این ناکاره وا کرد — غبار رهگذر را کیمیا کرد
نی آن نی نوازی، پاکبازی — مرا با عشق و مستی آشنا کرد

(کلیات اشعار فارسی اقبال، ص۴۴۳)

مراجع ومنابع:

۱- کلیات اشعار فارسی مولانا اقبال لاہوری، انتشارات پگاہ، تہران، ۱۳۶۱ش
۲- کلیات شمس تبریز، منشی نول کشور لکھنؤ، جولائی ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۲ق
۳- غزلیات شورانگیز شمس تبریزی، بانتخاب فریدون- کار، کتاب فروشی فروغی، تہران، ۱۳۴۳ش
۴- لوح فشردہ مثنوی معنوی، مرکز تحقیقات کامپیوتری علوم اسلامی، قم، ایران

☆☆☆

پروفیسرشاہدنوخیزاعظمی

ڈائرکٹرسی یوسی ایس،مولانا آزادنیشنل اردویونیورسٹی،حیدرآباد

اسلم جیراجپوری کی علمی فتوحات

مولانا اسلم جیراجپوری ہمہ گیرو ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے،جنہوں نے بحیثیت معلم علیگڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دونوں کی خدمت کی اوراسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردوزبان وادب کی ضخامت میں معلوماتی اضافہ کیا وہ ایک شاعر بھی تھے،نقاد بھی مورّخ بھی تھے ،معلم بھی مفکر بھی اور مبلغ بھی انہوں نے سیرت عمروبن عاص،تاریخِ امت، تاریخ القرآن لکھ کراردو دنیا کو تاریخ اورتاریخ اسلام سے آشنا کرایا۔ انہوں نے حیاتِ حافظ،حیاتِ جامی،علامہ اقبال اور نظامی گنجوی کی شاعری پھر بہترین تنقید کرکے اردو دنیا کو فارسی کے ان مشہور شعراء سے متعارف کرایا اوران کے اوصاف کواردوشعراء کے لئے مشعلِ راہ ثابت کیا۔ انہوں نے ایک شعری مجموعہ جواہر ملیہ بھی یادگار چھوڑا ہے،جس سےان کی شاعرانہ خــوبیــوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں صرف نظمیں ہیں۔ سب کی سب انتہائی معیاری اورگراں قدر ہیں۔مولانا اسلم جیراجپوری کو خدا نے مختلف علوم وفنون کی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کا محبوب ترین موضوع تاریخ اسلام تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی مشہور کتاب تاریخ الامت گراں قدراہمیت کی حامل ہے۔ اسلم جیراجپوری اپنی اس تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں۔

’’اب تک کوئی ایسی تصنیف تاریخ اسلام پر منظرعام پرنہیں آئی وتاریخی اصولوں کوسامنے رکھ کرترتیب دی گئی ہو۔ اس موضوع پرلکھی جانے والی بعض تصانیف میں سطحی اورغیرضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں جوتاریخ کےطلبہ کے لئے زیادہ مفیدنہیں‘‘

انہیں اسباب کے پیشِ نظر اسلم جیراجپوری نے تاریخ الامت کی تصنیف شروع کیا اس کے پہلے حصہ میں فن تاریخ پر بڑی عمیق بحث کی اورحقیقتِ تاریخ پرروشنی ڈالی ہے۔ مولانا تاریخ کی انتہائی آسان تعریف کرت ہوئے لکھتے ہیں کہ اہلِ زمانہ کے حالات اورواقعات کے بیان کوتاریخ کہتے ہیں۔ اس عام تاریخ میں ہرشخص کے حالات اور ہرقسم کے واقعات داخل ہیں اوراصلیت یہ ہیکہ فن تاریخ کی جوغرض ہے یعنی عبرت اورتجزیہ وہ ہرشخص کی زندگی کے سوانح سے کچھ نہ کچھ ہم حاصل کرسے ہیں۔تاریخ امت کی تصنیف کا کام اسلم جیراجپوری نے علیگڑھ کے زمانۂ قیام سے شروع کیا لیکن سیرت پاک سے متعلق پہلی ہی جلد ۱۹۲۲ء میں اس وقت منظرعام پرآئی جب اسلم جیراجپوری علیگڑھ

سے جامعہ ملیہ اسلامیہ جا چکے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں خلافت راشدہ سے متعلق دوسری جلد بھی شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی ۱۹۲۳ء میں اسکی تیسری جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی اس کے فوراً بعد چوتھی جلد بھی منظرِ عام پر آئی پانچواں حصہ جو عباسیۃ بغداد پر مشتمل ہے یہ جلد ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ ساتواں حصہ جو آلِ عثمان سے متعلق ہے ۱۹۳۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس طرح اسلامی تاریخ کی سات جلدیں اختصار کے ساتھ اسلم صاحب نے پیش کیں اور اس کے بعد تاریخ الامت کی آٹھویں جلد منظر عام پر آئی۔ یہ جلد اپنی تاریخ، ضخامت اور ضروریات کے مطابق انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ پوری اسلامی تاریخ کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں اس جلد میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب میں اسلم جیراجپوری نے ایک اسلامی تاریخ پیش کی اور ماضی کی اوراق گردانی کرتے ہیں یہ تجربہ اخذ کیا کہ قرآن سے دوری اور سنّتوں سے کنارہ کشی ہی قوم کی ذلت و پستی کا سبب ہے۔ اور جب تک قوم کا رشتہ قرآن اور سنت کے ساتھ مضبوط نہیں ہوگا تب تک یہ قوم گمراہی کا شکار رہے گی۔ اور اس پر طرح طرح کی آفات آتی رہیں گی۔ انہوں نے عہد قدیم کے مختلف فرقہ اور ان کی گروہ بندی کا تذکرہ بھی اس کتاب میں کیا اور ان کی تباہی اور بربادی کا تذکرہ بھی کیا تاکہ ملت ان سے عبرت کے کر اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرے۔

تاریخ الامت اسلم جیراجپوری کی گراں قدر تصنیف ہے انہوں نے اس کتاب میں تمام مباحث کو پیش کرنے کے بعد اسلام اور قرآن کی روشنی میں اسکا حل بھی پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک طویل داستاں بھی ہے۔ اور رہنمائی کا بہترین وسیلہ بھی۔ ہر داستان مکمل معتبر اور مستند ہے اور قرآن سے اسکی تصدیق بھی کی گئی ہے۔ یعنی یہ کتاب تاریخ الامت ہی نہیں بلکہ اصلاح امت بھی جس کے ذریعہ اس عہد کی بدحال اور پریشان امت کو ان کا روشن ماضی اور ان کے آباءاجداد کا عدل و انصاف، ان کے کارنامے اور ان کی سیرت اور کردار کو پیش کر کے عبرت لینے کا درس دیا گیا ہے تاکہ ملت کے منتشر افراد اس سے سبق لیں اور اپنے اندر اتحاد پیدا کریں کیونکہ اتحاد ہی فتح کی بشارت اور کامیابی کی کنجی ہے۔ تاریخ اور اسلامی تاریخ پر مولانا کی ایک مشہور تصنیف تاریخ نجد ہے۔ نجد تحریک بارہویں صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوئی اور اسی صدی کے آخر تک پورے عرب پر چھا گئی یہ تحریک چونکہ بہت جلد مقبول ہوئی اس لئے لوگوں میں یہ بدگمانی پھیل گئی کہ یہ تحریک انتشار پیدا کرنے اور گمراہ کرنے کے لئے چلائی گئی ہے۔ جہلاء کے ساتھ ساتھ امراء نے بھی اسکی زبردست مخالفت کی ہے۔ اور اس کو وہابی تحریک کا نام دیا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ تحریک اپنے مقصد میں کامیاب رہی اور اس نے بے شمار اصلاحی کارنامہ انجام دیا۔

تاریخ نجد میں اسلم جیراجپور نے مقام نجد شیخ محمد بن عبدالوہاب اور امراءنجد پر بڑے عالمانہ انداز میں بحث کی اور ان کے ہر گوشہ کو منور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تاکہ عوام ہی نہیں علماء ادب بھی اس تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد سے واقف ہوں۔ تاریخ نجد کا سبب

ِ تالیف اسلم جیراجپوری نے یہ بتایا کہ جس وقت حرم پر اہل نجد کا ظہور اور غلبہ ہوا تو ہندوستان کے لوگوں میں تاریخ نجد سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس وقت اس عنوان پر اردو میں کوئی بھی تصنیف تاریخ نہیں تھی۔ اسی کمی کو پوری کرنے کے لئے انہوں نے یہ کتاب تالیف کی اس طرح ۱۹۲۶ء میں تاریخ نجد کے عنوان سے اردو میں ایک دقیق مدلل، مفصل اور مکمل کتاب پہلی بار وجود میں آئی۔ جس سے لوگوں کو نجد کی جغرافیائی حالات ان کی غذا، لباس، خصائل، دینی شغف، علمی ذوق اور نظام حکومت سے واقفیت ہوئی اسلامی تحریک کے ساتھ ساتھ اسلم جیراجپوری نے صاحبِ سیف وقلم شخصیات کی سیرت پر بھی قلم اٹھایا تاکہ عوام ان کی خوبیوں ان کے علم وفن اور ان کے انداز بیاں وانداز تحریر کے ساتھ ساتھ ان کی شجاعت دلیری اور بہادری سے بھی واقف ہوں اور ان کی تقلید کرنے کی کوشش کریں اسی لئے انہوں نے اسلام کی مشہور قدر شخصیت عمرو بن عاص کی شخصیت اور سیرت پر قلم اٹھایا اور اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا کہ یہ تاریخ الامت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں درجہ ذیل ابواب عمرو بن عاص، زمانہ اسلام، فتوحات شام، فتوحات مصر، اسکندریہ پر فوج کشی، کتب خانہ اسکندریہ، مرکز مصر، انتظام مصر، ترتیب وحریت، عہد عثانی، حلم دشمن نواز، عہدِ علی ومعاویہ، امیر معاویہ وعمرو بن عاص، صفات عمر بن عاص، اور مناقب قائم کئے گئے ہیں۔اسکی ترتیب اسلم جیراجپوری نے مستند ماخذ سے انتہائی سلیقہ سے کیا ہے۔

اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح بزرگان دین اور مشاہرین اسلام کی زندگیاں سبق آموز ہیں۔ اسی طرح فتوحات اسلامیہ کے سپہ سالار عمرو بن عاص کی زندگی بھی ملت اسلامیہ کے لئے عبرت سے پر ہے۔ وہ دولت عربیہ کے ایک اہم رکن ہیں۔ اپنی قیادت کے سبب صحابہؓ کرام کے مابین ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ میدان سیاست اور میدانی کارزار میں لاثانی ہیں۔ ایک ماہر ادبیات تو دوسری طرف ماہر جنگ بھی ہیں۔ یعنی مرد صاحب تیغ وقلم تھے۔جب ہاتھ میں قلم ہوتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ ان ہاتھوں نے کبھی تلوار دیکھا تک نہیں ہوگا اور جب ان کے ہاتھوں میں تلوار ہوتی تھی تو ایسا احساس ہوتا تھا کہ اس کی پرورش تلوار کے سایہ ہی میں ہوئی ہوگی اور اس شخص نے قلم وکتاب پر ہاتھ بھی نہیں لگایا ہوگا اس طرح اس عظیم شخصیت نے ہر میدان میں اسلام کا علم بلند کیا۔ نوے سال کی عمر میں مصر میں ان کا انتقال ہوا وہ ایک متقی، زاہد، اور عابد تھے۔ رات کی رات عبادت میں گزار دیتے تھے اور ہمیشہ جہنم کے خوف سے لرزہ رہتے تھے۔

دولت عربیہ جن ستونوں پر قائم ہے۔ ان میں چار ستون انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

ا: خالد بن ولید جنھوں نے عراق، جزیرہ اور یرموک فتح کیا۔

۲: عمرو بن عاص جنھوں نے مصر، فلسطین اور طرابلس میں فتح حاصل کی۔

۳:ابوعبیدہ جنہوں نے شام کو فتح کیا۔

۴:حضرت سعد بن وقاص جنہوں نے قادسیہ اور مدائن میں فتوحات حاصل کیں۔

مولانا اسلم جیراجپوری کی ایک مشہور تصنیف اہل بیت کے عنوان سے ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تمام امہات المومنین اور ان کی بیٹیوں کے صحیح مستند اور معتبر تاریخی حالات عربی کی مستند کتابوں سے اخذ کر کے پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہیں تھی۔ جس کے سبب ان بہترین اور پاکیزہ عورتوں کے کردار سے ہمارا معاشرہ ناآشنا اور ناواقف تھا۔ اس تصنیف کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کتابیں اگر تھیں بھی تو عربی میں عربی زبان ہندوستان کی عوام وخاص کے لئے انتہائی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے لوگ اسے پڑھنے یا رکھنے سے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مولانا اسلم صاحب کی اس کتاب کو لوگوں نے بڑے شوق وذوق سے پڑھا۔ یہ کتاب اردو زبان وادب میں انفرادیت کی حامل ہے۔ اور عورتوں کے لئے مشعل راہ بھی تاکہ وہ اپنی زندگی میں یہ سیرت پاکیزگی اور پرہیزگاری پیدا کریں کیونکہ اسی میں ہی دونوں جہان کی کامیابی وکامرانی ہے۔ اس تصنیف کے علاوہ مولانا کا ایک مقالہ بھی خواتین کے عنوان سے ہے۔ جس میں صحابیات،صالحات، بیگمات،اور عالمات پر ۳۳/مقالات شامل ہیں۔ اس میں اسلم جیراجپوری نے ام المومنین حضرت خدیجہ،حضرت عائشہ،حضرت صفیہ،حضرت اسماء،حضرت ام عمارہ،حضرت ام سلیم،حضرت خنساء،خضرت خولہ،حضرت رابعہ بصریہ،حضرت سیدہ نفسیہ،حضرت زبیدہ کے حالات زندگی پیش کیا ہے۔ جو معاشرۂ انسانیت کے لئے درس عبرت ہیں۔ مولانا اسلم جیراجپوری مورخ اسلام اور ماہر دینیات ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین نقاد بھی تھے۔ انہوں نے حیات حافظ،حیات جامی،دو ادبی کتابیں بھی تحریر کیں۔ جو تحقیقی وتنقیدی اعتبار سے انتہائی اہمیت کے حامل ہے۔ ان دونوں کتابوں میں حافظ اور جامی کا بھرپور تعاون پیش کیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اسلم جیراجپوری صاحب نے علامہ اقبالؔ کے فارسی مجموعوں پر بہترین تنقید کیا ہے۔ مولانا نے اقبال کی خوبیوں اور خامیوں پر جس انداز سے اظہار خیال کیا ہے وہ ایک ماہر فن ہی کر سکتا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی مثنوی اسرار خودی میں عرفیؔ کو حافظؔ پر فوقیت دی لیکن اسلم صاحب نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ عرفیؔ خود اسی شمع حافظؔ کا پروانہ ہے۔

فارسی ادب سے ہی متعلق اسلم جیراجپوری کا ایک گراں قدر مضمون شیخ نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار پر ہے۔ یہ فارسی کی بہت ہی مشہور مثنوی ہے۔ اس کا انداز بیاں انتہائی دلکش ہے۔ اور زبان وبیان کی تمام خوبیوں کو اس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسلم جیراجپوری نے اس پر بھی جامع اور دقیق تبصرہ کیا ہے۔

مولانا نے علامہ اقبالؔ کے مجموعہ ضرب کلیم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ واضح کیا ہے کہ یہ کس قدر دلکش روح پرور مجموعہ ہے۔ اس میں اسلم جیراجپوری نے مہدی موعود کا ذکر کیا ہے۔ اور اس عقیدہ کی تردید کی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں مہدی موعود کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

اسلم جیراجپوری کی تصانیف میں حیات حافظ کو بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۹ء میں علیگڑھ قیام کے دوران تصنیف ہوئی جسکو مولانا نے تین ماہ میں تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے علمی تنقیدی اور تحقیقی انداز اپناتے ہوئے خواجہ حافظ شیرازی کی زندگی اور شاعری پر بڑے دلکش انداز میں عکاسی کی ہے۔

اسلم جیراجپوری نے اس کتاب کو لکھنے کا سبب یہ بتایا کہ حافظ شیرازی کے اندر دو طرح کے کمال تھے۔ ایک تو وہ نہایت بزرگ صوفی تھے دوسرے بہت بڑے شاعر۔ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان پر بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ مزید لکھتے ہیں کہ ہم نے جس وقت ان کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا تو شعراء کے تذکرے دیکھئے صوفیاء اور مشائخ کے حالات پڑھے بہت سی تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا مگر معدودے حالات اور چند خرافات حکایتوں کے سوا اور کچھ نہ ملا۔

اس کتاب میں انہوں نے حافظ شیرازی کی سوانح ابتدائی حالات قرآن سے انکا شغف اس عہد کی شعری فضاء اور حافظ شیرازی کی ابتدائی شاعری اس کے بعد انکی پختہ شاعری، شاعری کے اسباب، شاعری کے اصناف اور غزل میں انکی مہارت اور غزل میں انکی مقبولیت اور ان کی غزلوں کی خوبیوں کو بہت اچھے انداز میں تنقیدی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ حافظ شہزادی کی تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے دیوان کے علاوہ کچھ بھی محفوظ نہیں اس دیوان کے معتقد محمد گل اندام نے حافظ کے انتقال کے بعد ترتیب دیا جسکی وجہ سے ان کے اشعار میں دوسروں کے اشعار کی آمیزش ہوتی ہے۔ مولانا نے حافظ کی غزلیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور انہیں ایک فطری شاعر قرار دیا کہ انہوں نے اپنے جذبات کی عکّاسی کیلئے استعارات اور تشبیہات کا سہارا لیا۔ ان کی شاعری حقیقی احوال پر مبنی ہے۔ انکی شاعری میں جدتِ مفاہیم و معانی کی بلندی اور بے پناہ سلاست موجود ہے۔ انہوں نے مشکل ترین چیزوں کو آسان انداز میں ادا کیا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات کی ادائیگی میں اشکالات و اختلافات کو آنے نہیں دیا۔ انکے یہاں شوخی اور ظرافت بھی ملتی ہے۔ انہوں نے واعظ اور صوفی پر جو چوٹ کی اس میں بھی حکمت موجود ہے۔ انکی شاعری عشق و مستی اور شباب سے پر ہے۔ اور یہ چیز انکے خمیر میں شامل ہے۔ یہ جذبہ انکے اندر اس قدر کثرت سے موجود تھا کہ وہ ناچتے ہوئے، ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور پاؤں پٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جوش اور جذبہ انتہا پر نظر آتا ہے۔

انکی شاعری تصویر کشی کی ایک زندہ مثال ہے۔مولانا اسلم جیراجپوری نے ان کی شاعری کی ایک صفت یہ بھی بتائی کہ انکے دیوان میں عربی اشعار بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے انکی عربی دانی کا ان کار نہیں کیا جاسکتا۔ انکی شاعری پر تصوف کا کافی اثر ہے۔آپ کا دیوان روحانی لطائف اور حقیقی اسرار سے لبریز ہے۔ انکی شاعری میں جگہ جگہ عشق ومحبت کا ذکر ملتا ہے۔اوراس پر اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ انہوں نے عیاری ومکاری سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ تا کہ محبت اور شیفتگی میں اضافہ ہو۔

اسلم جیراجپوری کی دوسری تصنیف حیات جامی بھی بہت مشہور ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن نورالدین جامی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور علمی کارناموں کو جاننے کے لئے یہ حددرجہ معاون ومددگار رہے۔ اس کتاب میں جامی کی شاعری کا عالمانہ اور محققانہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ترتیب دینے کے لئے اسلم جیراجپوری نے صوفیاء اور شعراء کے بیسوں تذکروں کا مطالعہ کیا بالخصوص ان کے ہم عصر مؤلفین کی تالیفات، رشحات، لطائف، الطّوائف، تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور مجالس العشاق سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ خود انکی تصانیف، تراجم کتب، اور یورپین مصنفین کے خیالات کا بھی اسلم جیراجپوری نے مطالعہ کیا۔ان تمام چیزوں کی روشنی میں نہایت جامع انداز میں یہ کتاب ترتیب دی ہے۔

پھر اسلم جیراجپوری نے جامی کی شاعرانہ عظمت پر بحث کی اور انہیں فارسی کے سات شعراء فردوسی، انوری، نظامی، رومی، سعدی، حافظ اور جامی میں شمار کیا جو مختلف حیثیتوں سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ مثنوی میں فردوسی اور نظامی، قصائد میں خاقانی اور انوری، رباعیات میں خیّام اور ابوسعد، تصوف میں عطا اور مولانا روم، غزل میں سعدی اور حافظ، جامعیت میں خسرو اور جامی کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن مولانا جامی کی شاعری اپنی علمیت اور پاکیزگی کی وجہ سے دیگر شعراء سے منفرد اور ممتاز ہے اور تمام چیزوں کو مولانا اسلم جیراجپوری نے حیات جامی میں اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

ان تصانیف کے علاوہ اسلم جیراجپوری نے بہت سے مقالات تحریر کئے جو کہ ملک اور بیرون ملک کے مشہور رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔مقالات کے موضوعات بھی مختلف تھے جیسے قرآنیات، اسلامیات، ادبیات، اور تاریخ وغیرہ آپ کے مقالات کے چار مجموعہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ایک مجموعہ مقالات اسلم کے عنوان سے، دوسرا نوادرات، تیسرا ہمارے دینی علوم اور خواتین کے عنوان سے ہے۔مقالات اسلم کے تمام مضامین نوادرات میں ضم کردئے گئے ہیں۔ اس طرح ان کے مقالات کے تین مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا اسلم جیراجپوری کے بہت سے مقالات ایسے بھی ہیں جو کسی بھی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں اور کئی مقالے شائع بھی ہوئے۔ مگر اب انکا وجود کہیں نہیں ملتا یعنی

وہ بھی نایاب ہوگئے۔ جن میں امت مسلمہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔مولانا اسلم جیراجپوری نے ان مقالات میں اپنے علم وقلم کا زور دکھایا ہے۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب علم وفن تھے اور صاحب قلم کی بہت قدر کرتے تھے۔مولانا اسلم جیراجپوری اردو اور فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں انہوں نے شاعری کی مگر عربی اشعار کی تعداد بہت ہی کم اور جو ہیں بھی ان تک رسائی اہل اردو کے بس سے باہر ہے۔فارسی اور اردو میں ان کے اشعار کی تعدار بہت ہے۔ اور ہر شعر بلند پایہ ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع بھی اسلامیات ہے۔ انہوں نے شاعری طبع آزمائی اور تفریح طبع کے لئے نہیں کی بلکہ اس کا مقصد اصلاح تھا۔ ان کا ہر شعر اصلاحی ہے اور کسی خاص موقع یا حادثہ پر کیا گیا ہے۔ یعنی انکی شاعری ان کے دل کی آواز تھی۔ اسی وجہ سے اس میں تاثیر پائی جاتی ہے۔ اردو شاعری میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کو جواہر ملیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تمام نظمیں معیاری اور شاعرانہ خصوصیات سے آراستہ ہیں۔انہوں نے شاعری کی تمام مشہور اصناف میں طبع آزمائی کی انکی شاعری میں سادگی، سلاست اور سنجیدگی پائی جاتی ہے تاکہ شعر عام فہم بھی ہوں اور اصلاح کے لئے کارگر بھی ہوں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں قوم کا شاندار ماضی اور سپہ سالارِ ملت کے کردار کو پیش کیا تاکہ موجودہ و آئندہ نسل اس سے عبرت اور سبق لیکر زندگی کی شاہراہ پر زندہ دلی سے گامزن ہوسکے اور کامیابی اور کامرانی انکا قدم چومے۔

مولانا اسلم جیراجپوری نے چند فارسی نظمیں بھی لکھیں، جس کی روشنی میں انہیں فارسی کا بھی ایک بہترین شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ان نظموں میں بھی انہوں نے اپنے جذبات واحساسات قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں وارداتِ قلبی کا اظہار کیا ہے۔ ان کی نظموں میں آمد ہے آورد نہیں۔ انکی ایک مشہور نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قطبیٔ پیش عمر نالید زار کاسأ امیر عادل گردوں وقار
عاملِ مصر تو آلِ عمرو بن عاص آبرویم ریخت پیش عام و خاص
هردو در جولا نگهیس می باختیم اسپهائے خویش ، باهستم باختیم
باره ام چون بود گرم تند و تیز من سبق بردم از و جست وخیز

ان اشعار کی داستان یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک قبطی کا گھوڑا عمرو بن عاص کے گھوڑے سے آگے نکل گیا۔ اس پر عمرو بن عاص کے لڑکے کو غصہ آگیا اور اسنے اس قبطی پر بے پناہ کوڑے برسائے قبطی نے حضرت عمرؓ سے فریاد کی تو انہوں عمرو بن عاص اور انکے بیٹے کو بلایا اور قبطی

کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور کہا کہ ان دونوں میں جس نے تم کو مارا ہے تم اسی قدر اس کو مار کر اپنا بدلہ لے لو۔ چنانچہ قبطی عاص کے لڑکے عبداللہ پر کوڑے برسائے۔ اسکے بعد حضرت عمرؓ نے قبطی سے کہا کہ عمرو بن عاص پر بھی کوڑے برساؤ تو اس نے نفی میں جواب دیا کہ یہ تو میرے مربی ہیں۔ اسی طرح بے شمار عدل وانصاف کی داستان کو اسلم صاحب نے اشعار میں پیش کیا۔ ایک بار وہ بھوپال میں اپنے والد کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے گئے۔ دیکھا تو قبر پر جا بجا گندگی پھیلی ہوئی تھی ان کے دل کو بہت تکلیف پہنچی۔ انہوں نے اس کو شعری قالب میں ڈھال کروائیٔ بھوپال کی خدمت میں بھیجا اور صفائی کی درخواست کی۔ اس نظم کے چند اشعار اس طرح ہیں!

حضرت نواب سلطان جهاں گردوں و قار　　آنکه باصد حشمت و شوکت جهاں بانی کند
فرّهٔ اقبال اسمش راسمی کرده است　　در جهاں چون نام خود بتگر که سلطان کند
مادرِ مشفق بود بهرم مسلمانِ هند　　مشکلات قوم مارا حل بآسان کند
نیت پاکش چو صافی ترز اب گوهراست　　درهمه مدد تائید نیردانی کند
مدح مقصد نیست اینجا مدعاء دیگر　　ورنه اسلم هم تواند آنچه خاقانی کند

اسلم صاحب کی اردو اور فارسی نظمیں علیگڑھ منتھلی میں شائع ہوتی تھیں یہ مشہور مجلّہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۹ء تک بڑی آب وتاب کے ساتھ نکلتا رہا اس کے بعد یہ مجلّہ علیگڑھ میگزین کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اور آج تک جاری ہے۔ ایک نظم اس میں ''خطاب بآقائے ایرانی'' کے عنوان سے شائع ہوئی اس نظم کا وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ حاجی مرزا ابوالقاسم ایرانی نے جریدہ ''حبل المتین'' کلکتہ میں اس موضوع پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا کہ فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کیا جائے اور اصلی کیفیت اور شکل کو بحال کیا جائے۔ اسلم صاحب کو اس تحریک سے بہت خوشی ہوئی اور ابوالقاسم کی شان میں بطور عقیدت یہ نظم پیش کیا۔ یہ نظم ۱۲۶ اشعار پر مشتمل ہے چند اشعار نمونے کے لئے ملاحظہ ہوں۔

ابو القاسم چه فرخ می زائے ست　　که گلکس بلبل دستان سرائے ست
صدائے نغمه است آرام جان است　　نوائے زمرحه اش دلکشائے ست
کلامش چون نباشد چون زرتاب　　مداد خامه اور کیمیاء است
چنان ایں پارسی باب **بنو** شت　　که گوئی سلك دربے بهائے است

مئے خالص کہ درجام سخن ریخت | حریفاں رائیے مستی صدائے ست
نوائے غالب و یفحاء شنیدم | بجائے تو کہ بافن آشنائے ست

علیگڑھ منتھلی میں اسلم صاحب کی ایک نظم ''درشکایت زمانۂ فخر خود'' کے عنوان سے شائع ہوئی اس نظم کے متعلق مدیر نے نوٹ لکھا کہ شاعر چونکہ اقلیمی جذبات زیرِ قلم رکھتا ہے اس لئے یہ حق بھی ہے کہ وہ اپنی مدح کر سکے کیونکہ نفس کا احساس کمال بھی ایک طبعی ہے جو شاعر کے رقبۂ حکومت سے خارج نہیں۔ مزید اس نظم کے متعلق لکھا کہ مندرجہ ذیل نظم ہمارے دوست نے کسی مقام پر اس وقت لکھی تھی جب چند اہل جاہ و دولت نے بغض و حسد کی وجہ سے ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ ایک مدت کی لکھی ہوئی ہے لیکن اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس میں اکرام نفس اپنے علم و کمال کی قدر اس کے مقابل میں دنیاوی جاہ و دولت سے بے نیازی اور استغناء سب امور سبق آموز ہیں۔ ایسی نظمیں صرف شاعرانہ تعلّی کی نمونہ ہوتی ہیں۔ غرور و تکبر خودنمائی پر مبنی نیں ہوتیں، اس لئے اس نظم کے چند اشعار عبرت، سبق اور تمثیل کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

باکہ گوید قصہ ھائی غم دلِ ناشاد من | جز تو یارب کیست آن کو بشنود فریاد من
آرزو ھائی دلِ من رفت در طوفان یاس | صرصر غم کردو ویراں گلشن آباد من
ھر سحر چوں سر برآدم من ستدا الحان | یك بلائے تازہ تا گوید مباکباد من
دشمن اھلِ فن شد شیوہ گرد ون دون | زین گنہ خواھد کہ ازھا افگند بنیاد من
حاسداں را درپۓ آزار من انگشت | گز حسد صفرائے شاں جوشد برا استعدادمن
ناکسانی چند صد از بستد اینجا روز و شب | لطف طبع من مگر زنہار ستاندداد من

نواب مزمل خان قوم پرست ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فن کے شیدائی بلند پایہ مصنف عمدہ ادیب اور ایک بہترین شاعر بھی تھے جبکہ بظاہر وہ ایک فوجی رہنما ہی سمجھے جاتے تھے۔ ایک بزم شبینہ میں انہوں نے مولانا رشید احمد سالم اور حافظ اسلم جیراجپوری پر اپنے جذبات کا اظہار ان اشعار میں کیا!

یك خواجہ سالم است و دیگر خواجہ اسلم است
فضل و کمال بردو بعالم مسلم است

خـان والا شـان مـزمـل کـے نـام نـامیـش و صف پیـغـمبـر تـلـفـظ خـاص قـرآن کـنـد
آنکـه بـاصـد عـزت و اقبال و جاه و احترام بـروئیـان زمـانـه میـری و خـانـی کـنـد
آنکـه نـوایـش خـطـابست از شهنشاه زمان مـی سـزد گـر فـخـر سـروے قـوم شـروانی کند
آنـکـه دانـد پـارسـی و تـازی و انـگیستـه بـے تـکـلف انـدریـں هـر سـه سخن دانی کند
آنکـه دربستـان مـعـنی و بلاغت گستری کـلك انـکـنیـش چـوطـوطی شکر افشانی کند
آنکـه بـاشـدقـدردانِ اهـلِ عـلـم و اهلِ فن لـطف خـلـقـش از پـئـے دل خسته درمانی کند

اسی بزم شبینہ میں اسلم صاحب کے ان اشعار کے جواب میں نواب مزمل خانصاحب نے اسلم صاحب کی شخصیت اور شاعری کی تعریف ان اشدار میں کیا ملاحظہ ہو!

اسـلـم جیـراجپـوری شـاعـر شیـوه بیـان آنکـه در مـلك فـصـاحـت میـری و خوانـی کند
گـر بیـفـنـد درپـس صیـد مـضـامیـن بلند اسپ نـکـرش بـرسـرِ افـلاك جـولانـی کـنـد
طبـع مـوزونـش بـنـکـر گـوهـر مـعناتی نغز سیـد قـعـر قـلـزم جـودن بـآسـانـی کـنـد
شهـر عـلـم آمـد نبیؐ و بـاب عـلم آمد علی اسـلـم از بـحـث بـلـنـد خـویـش دربانی کند

اسلم جیراجپوری کی شاعری اور شاعری کے متعلق اس عہد کے اہلِ قلم کی رائے یہ گواہی دیتی ہے کہ اسلم جیراجپوری ایک بلند پایہ شاعر تھے اور ہر محفل و مجلس میں ان کی شاعری کی پذیرائی ہوتی تھی ان کا انداز بیان دلکش، عام فہم اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر گہرائی و گیرائی بھی رکھتا ہے ان کی شاعری کا جوہر زیادہ تر نظموں میں ہی دیکھا گیا اور ہر نظم کسی حادثہ یا واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ زبان پر بھی کامل دسترس رکھتے اور اپنے جذبات واحساسات کو جب چاہتے تھے شعری قالب میں قلم بند کر دیتے تھے کیونکہ وہ ایک اعلیٰ شاعرانہ طبیعت کے حامل تھے فارسی کی طرح انہوں نے اردو میں بھی شاعری کی جو ہر ملیہ کے عنوان سے ان کا ایک شعری مجموعہ بھی ہے۔ ان کی پوری شاعری قرآن وحدیث سے متاثر نظر آتی ہے۔ بہت سی احادیث اور آیات کو انہوں نے شعری جامہ عطا کیا اسکے علاوہ انہوں نے بہت سے اسلامی واقعا سے متاثر ہوکر نظمیں لکھیں۔ ان کی شاعری میں اسلامی ذہن بالکل صاف نظر آتا ہے چونکہ آپ حافظ قرآن اور مورخ اسلام تھے اسلئے آپکا تعلق ملت اسلامیہ سے بہت ہی گہرا تھا۔ انہیں ملت اسلامیہ کے انحطاط کا شدید دکھ تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں سپہ

سالارِ اسلام کے کردار بہادری،عدل وانصاف سادگی اور اسلام پر خود سپردگی کے جذبات کو پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ آنے والی نسلیں ان سے سبق لیں اور اسلام پر فنا ہونے کا ان میں جذبہ پیدا ہو کیونکہ اسلامی طریقہ زیست ہی اصل طریقہ حیات ہے اور اسی پر چل کر دونوں جہان میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس طرح اسلم جیراجپوری نے اسلامی نظریات وخیالات اور اسلامی افکار کو ہی اپنی شاعری کا موضوع بنایا اورانہوں نے پوری زندگی اسی موضوع کو خوب سے خوب تر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اور یہ ہی وہ موضوع ہے جو ان کی شاعری کو منفرد اورممتاز کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انہوں نے جب چاہا جس واقعات کو شعری قواعد وضوابط کے مطابق شعری قالب میں ڈھال دیا اور یہ ہی ایک بہترین شاعر کی خوبی ہوتی ہے۔اسلئے اسلم جیراجپوری کا مقام بحیثیت شاعر،نقاد،اور مورّخ،مستند ہے۔ انہوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کی اردو کے دامن کو سیرت تاریخ تنقیدی اور شاعری سے مالا مال کر دیا اور اگر دیگر شعراء اور مصنّفین سے ان کا موازنہ یا مقابلہ کیا جائے تو بھی ان کی جامعیت انہیں فوقیت دے گی کہ وہ عالم دین تھے اور عالم ادب بھی،مورّخ اسلامیات بھی تھے معلم دینیات بھی،انہیں فکر معاش نہیں بلکہ فکر دوعالم تھی اور اسی فکر نے ان کے قلم میں زور پیدا کیا ہے۔

☆☆☆

سید فیض علی شاہ قادری نیازی
خانقاہ قادریہ نیازیہ، آگرہ

اخلاقِ کریمانہ اہلِ تصوف: طالب آملی کے ایک شعر کی روشنی میں

دُشنامِ خَلق را ندهم جُز دُعا جواب
ابرم که تلخ گیرم و شیرین عِوض دِهم
(طالب آملی 1585-1626ء)

ترجمہ: میں مردُم کی دُشناموں، گالیوں کا دُعا کے بجُز کُچھ جواب نہیں دیتا، میں ابر کی طرح ہوں کہ میں بحر کا تلخ آب لے کر اُس کے عِوض میں بارش کا شیریں آب دیتا ہوں۔

طالب کی شاعری کا اصل عنوان حسن شناسی ہے۔ یہی احساسات شروع سے آخر تک اس کی فنی تخلیق کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مجھے ان کے کلام میں عشق اور جدت کا پہلو نمایاں خصوصیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ طالب کے اس شعر میں خوش خلقی اور متصفانہ رنگ نظر آتا ہے جہاں جہاں ابر کی تشبیہ نے شعر کی تصوراتی شکل کو خوبصورت بنا دیا ہے عزت نفس اور خود ستائیش کا پہلو نکلتا ہے شیریں آب یعنی بارش کے پانی کے فوائد کی تفصیل میں جائیں تو شعر کی تشریح طویل ہو جائیگی پھر بارش کا یکساں یا ظروف کے مطابق فیضیاب کرنا آپ تصور کر سکتے ہیں برائی کا جواب اچھائی سے دینے کی یہ تمثیل شاعر کے بلند تفخر کو ظاہر کرتی ہے۔

ملک الشعراء دراد ب فارسی طالب آملی کا یہ پرلطف شعر مومن کی صفت اور اسوہ رسول وآل رسول واولیاء امت کا آئینہ دار ہے۔
اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ۔نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ 96)

" آپ ان کی بدی کا دفیعہ ایسے برتاؤ سے کر دیا کیجیے جو بہت ہی اچھا (اور نرم) ہو، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ (آپ کی نسبت) کہا کرتے ہیں" [سورہ مومینون ۹۶]

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے:" میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا۔ آپ ﷺ دھاری دار نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے جس پر چوڑی کناریاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک دیہاتی آپ ﷺ سے ملا، اس نے آپ کی چادر پکڑ کر اتنے زور سے کھینچی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے مونڈھے کے اوپر اس چادر کی رگڑ کے نشان دیکھے، اس نے کہا: اے محمد ﷺ اللہ کے مال میں سے جو تیرے پاس ہے مجھ دینے کا حکم دو، رسول اللہ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے پھر ہنسے اور اس کو کچھ دینے کا حکم دیا"۔ صوفیوں کے طرز و اتوار میں یہی مزاج عملی شکل میں موجود ہے امام جعفر صادقؑ نے عنوان بصری کو جو چند نصیحت فرمائی تھی اس میں ایک بات یہ تھی کہ تمہارا حلم ایسا ہونا چاہیے کے کوئی تمہیں ۱۰ بُری باتیں

کہے تم ذکر خیر سے جواب دو‘‘

" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی یہی فرماتے ہیں: اچھے لوگ بھینس کی مانند ہیں، جو سوکھی گھاس کھا کر بھی قیمتی دودھ دیتی ہے"۔

اردو فارسی کے مشہور صوفی شاعر حضرت تراب علی شاہ قلندرؒ نے اسی مضمون کو اس انداز میں ادا کیا ہے:

ہم تو بدخواہ نہیں اپنے مخالف کے ترابؔ بدی جو ہم سے کرے اس کی بھی خدا خیر کرے

طالب نے قصیدہ سے ۲۱ سال کی عمر میں شروعات کی مثنوی قطعات رباعیات سب ہی اچھے کہے ہیں لیکن غزل میں امتیازی درجہ حاصل کیا دوسری صنف سخن قصیدہ ہے جس نے درباروں میں ان کو مقبولیت عطا کی، یہ بات بھی غور تلک ہے کہ اس عہد میں فارسی ادب سبک ہندی میں غزل کے عروج کا دور تھا عرفی شیرازی اور صائب اصفہانی، جان محمد قدسی مشہدی، ابوطالب کلیم، صالح کشفی طالب آملی جیسے استاد شعراء نے فن تغزل فارسی کو اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا تھا ان سب کو شہرت ہندوستان مغلیہ کے دربار سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ اپنے سفر کے دور بزرگ ترین لوگوں سے ملے ان تجربوں نے اُن کے علم کو مذید ظریف وعمیق کر دیا جیسے وہ کہتے ہیں:۔

علم کے در مکتب دل آموخت سهل است آن علم شریف است در محفل آموخت

ترجمہ: علم جو مکتب میں دل نے پڑھا وہ تو آسان علم ہے، یہ علم جو تیری محفل میں سیکھا وہ اشرف واعلیٰ ہے

انہی قدردان محفلوں کی خواہش ان کو شعروادب کے جوہر شناس مغلوں کے دربار میں کھینچ لائی وہ آمل استرابات ایران سے کاشان خراسان اور قاندھار ملتان لاہور دہلی ہوتے ہوئے آگرہ آئے اس سفر میں بہت سے امراء حکام کے دربار میں عزت حاصل ہوئی یا یہ کہیں کہ یہ سب دارالحکومت پہنچنے کا وسیلہ بنے، بلآ خر آگرہ کے خواجہ قاسم دیانت خان جو امرائے جہانگیر کے مقربین خاص میں سے تھا اس نے اس کی سر پرستی کی اور سرپرستی کرتے ہوئے عبداللہ خان فیروز جنگ جو گجرات کا حاکم تھا خواجہ قاسم دیانت خان کی سفارش میں اس کو خط لکھا۔ لہٰذا عبداللہ خاں فیروز جنگ نے طالب کو بلایا۔ اس کے یہاں بھی اسے بڑا اعزاز واکرام حاصل ہوا۔ لہٰذا وہ اپنی دعوت پر بڑے فخر کا اظہار کرتا ہے۔

شاہ پور تہرانی کے توسط سے اعتمادالدولہ (والد نور جہاں) کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ اس نے طالب کو مہرداری کی خدمات سپرد کر دیں اگرچہ ایک معزز خدمت تھی، لیکن اس کا مزاج شعروشاعری کی طرف راغب تھا۔ لہٰذا اس سے انجانے میں غلطیاں سرزد ہو جاتی تھیں جس کی وجہ سے اس کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ نتیجتاً اپنی خدمات سے معذرت کی اور استعفیٰ دے دیا۔ آخر کار (پدر نور جہاں) اعتماد الدولہ وزیر اعظم کے توسط سے دربار جہانگیری میں رسائی حاصل کی۔ 'مغلوں کے ملک الشعرا' میں اس طرح تحریر ہے:

’’طالب کی زندگی میں وہ مکمل خوشی کا دن تھا۔ ایسی خوشی جو عرصہ دراز کی آرزو اور انتظار کے بعد حاصل ہوئی۔ اس انبساط میں یقین کی سی کیفیت تھی‘‘ (ص،194) جس نے پہلی حاضری میں لب کشائی نہ کر سکے۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا کہ شعروشاعری طالب کے مزاج وفطرت میں سمائی ہوئی تھی۔ جہانگیر نہ فقط حکمران وقت تھا بلکہ وہ ایک

زبردست نقاد،انشا پرداز ہونے کے ساتھ شاعرانہ ذوق کا بھی مالک تھا۔ انتظام اللہ شہابی اپنے مضمون'' آگرہ کے فارسی شعراء'' 1936 میں لکھتے ہیں:

اکبر کے بعد جہانگیر کا عہد آیا، بابا طالب اصفہانی۔حیاتی گیلانی۔ملّا نظیری نیشاپوری۔ملّا محمد صوفی مازندرانی۔ملک شعراء طالب آملی۔میر معصوم کاشی،ملا حیدر حصافی ملا تنیدا اکبر آبادی اس عہد کیشہور شاعر تھے۔

جہانگیر کوشعروسخن سے دلچسپی ہی نہیں بلکہ من سخن فہمی اورنکتہ سنجی میں خاص ملکہ تھا۔اورخود بھی گاہے ماہے فکرسخن کرتا تھا۔ایک دفعہ جہانگیر کی مدح میں مسیح پانی پتی نے ایک قصیدہ پڑھاجب مصرع ذیل پر پہونچا۔

"اے تاج دولت بر سرت۔ از ابتداء، تا انتها"

جہانگیر نے تیوری چڑھا کر پوچھا مسیح تجھ کوعلم عروض سے اوراوزانِ شعر سے بھی واقفیت ہے۔مسیح نے عرض کیا حضور جوموزوں طبعیت ہوں علم عروض نہیں جانتا۔بادشاہ نے کہااگر توعلم عروض سے واقف ہوتا تو اسی وقت تیرا سر قلم کر دیتا اورخود مصرع کی تقطیع کی۔

" اے تاج دو۔لت برسرت۔ازا ابتدا۔ تا انتها"

کہ اس میں رکن ثانی اس طرح آتا ہے۔لت برسرت جوسخت معیوب ہے۔جہانگیر کے نتائج فکر سے ایک شعرنقل ہے۔

وقت نیاز و عجز جهانگیر هر سحر امید آنکه شعله در از اثر رسد

یہ سب علمی چرچے آگرہ کی سرزمین پر ہوئے۔

لہٰذا اس گوہر نایاب کی قدر و قیمت کو پرکھ لیا، اس کی پوشیدہ صلاحیتوں اورخوبیوں کو اپنی دانشمندی سے بخوبی سمجھ لیا اور اس نے جہانگیر کی مدح میں کہے گئے پرشکوہ قصائداور پرزورغزلیات کی وجہ سے دربارشاہی سے خوب خراج تحسین حاصل کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ جہانگیر نے اس کے سر پر'ملک الشعرا' کا تاج رکھ دیا۔1028ھ میں اسے اس معزز خطاب سے سرفراز کیا۔" تذک جہانگیر "میں اس واقعہ کا ذکر ہے سفر کشمیر میں طالب آملی بادشاہ کے ساتھ تھے کئی قصائداسی سفر کے دوران کشمیر میں لاہور یا کشمیر میں وفات ہوئے 1626ء لاہور کے پاس دفن ہے۔ملا شیدا نے اس کی وفات پر کہی اس رباعی کے آخری مصرعے ''حشرش بہ علی ابن طالب باد'' سے اس کا سال وفات 1036ھ مطابق 1626 نکلتی ہے۔

ذیل میں طاکب آملی کے چند متصوفانی اشعار بطورنمونہ پیش کئے جارہے ہیں،سماعت فرمائیں:

عشق در اول و آخر همه ذوقسست وسماع ایں شراب است که هم پخته وهم خام خوشست

ترجمہ:عشق اپنے شروع اورآخر میں ذوق ہے سماع ہے یہ وہ شراب ہے جوکچی ہوتو بھی اچھی ہے پکی ہوتو بھی اچھی ہے

یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

شکوه عشق دریں تنکنا نمی گنجد بروں زکون و مکانم نشیمنی نمائی

نه ملامت گر کفرم نه تعصب کش دین   خندو بر جدل شیخ و برهمن دارم

طالب مذہبی تعصب سے پاک ہر طریقئے عبادت کی عزت کرتے ہیں۔

طالب از اسلام زاهد کس رخ فیضی نه دید   زین سبب یك عمر باکیش برهمن ساختیم

~~~~~~~~~~~~~~~

ائئی برهمن نقل مزهب گاه گاهی هِم خوش است   لطف کن تسبیح من بستان و زنّارم بده

اہل عشق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر طریقہ میں اللہ کا عشق تلاش کرتے ہیں۔نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

میں عشق کی ملت میں ہوں اے شیخ و برہمن   جا عشق مرا سبحہ و زنار سے کہدو (حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلویؒ)

تیری رحمت کفر و دیں کے مخمصوں سے ماورا   تجھ کو کچھ مطلب نہیں تسبیح سے زنار سے (حضرت شاہ محمد تقی عزیز صاحب رآز بریلوی نیازی)

طالب آملی کا متصفانہ رنگ کا ایک شعر پیش کیا جارہا ہے:

بدل بمعرفت دوست روشنائی به   چراغ انجمن عارفاں خداهی به

دل دوست (عارف) کی معرفت اس لئے حاصل کرتا ہے کہ خدا تک رسائی کی راہ عارفوں کی صحبت ہے خدا تک پہنچنے کی روشنائی فراہم کرتی ہے۔اس کی تمثیل آگرہ کے مشہور صوفی شاعر حضرت سید امجد علی شاہ قادری اصغرا کبر آبادیؒ کے کلام میں مزید وضاحت کے ساتھ ملتی ہے:

چه پروائے دنیا بود عارفاں را   که دیدند ایشاں خداء جهاں را

منم که داغ دل عارفاں مجذوبم   همیشه باخرد و هوش گرم آشوبم

طالب نے کئی غزلوں میں آشوب تخلص بھی استعمال کیا ہے،تصوف میں مجاز کو حقیقت کی ابتداء مانا جاتا ہے طالب نے اسی نذریہ کو بیان کیا ہے کہ ہوس حضرت عشق میں دلوں کی ہدایت اور رہنمائی کا کام بھی انجام دیتی ہے اور "مجاز" "راہ طریقت میں 'خضر راہ' کا کام دیتا ہے:

هوس هدایت دلها کند به حضرت عشق   مجاز هاهمه خضر ره حقیقت ها ست

انکسار تصوف کا اہل وصف ہے اخلاق انسانی کا درخشاں باب ہے جس کی تعلیم خانقاہ میں دی جاتی ہے ادب سے ہی سالک کی تربیت کی ابتداء ہوتی ہے محمد طالب آملی نے کئی اشعار میں بیان کیا ہے:

مئی عروج مرا نشۀ تکبر نیست   بپای ذره در افتم گر آفتاب شوم

عروج کا جام مجھے تکبر کے نشہ میں مبتلا نہیں کرتا آفتاب کی طرح جو اتنی بلندی اور تابنا کی کے باوجود ذروں کے قدم پر جھکتا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ یہ مضمون طویل ہو جائے گا طالب آملی کی کلام میں بہت سے مضمون تصوف کے ملتے ہیں جو سے مراد ان کو صوفی منش یا صوفی ثابت کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی وجہ فارسی علم و ادب میں تصوف و فلسفہ کے گہرے اور بنیادی اثرات ہیں جو خواجہ امیر خسروؒ، حکیم سنائیؒ، جلال الدین رومیؒ، فخر الدین عراقی، شیخ سعدی شیرازی، حافظ شیرازی کی قائم کردہ ہیں۔جس کو غیر صوفی شعراء کی ایک
~~~~~~~~~~~~~~~

بڑی جماعت نے بیان کیا ہے عرفی شیرازی سید محمد طالب آملی بھی شامل ہیں۔طالب آملی کے اس شعر سے اپنے مضمون کو ہیں ختم کرنا چاہوں گا:

به ایما نکته می سنجد نمی دانم زبانش را　　　　خدایا فیض الهامی که دریابم بیانش را

ماخذ و منابع:

* قرآن: سورہ مومنون ۹۶
* صحیح بخاری الفتح ج ۱۰ ص ۲۸۷ حدیث ۵۸۰۹
* صحیح مسلم بشرح النووی ج ۷ ص ۱۹۴ حدیث ۸۱۳۷
* دیوان حضرت شاہ نیاز بے نیاز احمد قادری چشتیؒ
* دیوان راز و نیاز حضرت شاہ محمد تقی نیازی راز بریلوی
* تذکرہ میخانہ، ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی، باتصحیح و تکمیل تراجم، باہتمام، احمد گلچین معانی، چاپ چہارم، 1363ش۔
* تذکرۃ الشعرا، علی قلی خان والہ داغستانی، جلد اول، مقدمہ تصحیح و ترتیب پروفیسر شریف حسین قاسمی، کتاب خانہ رضا رامپور، 2000۔
* تذکرہ مجمع النفائس، سراج الدین علی خان آرزو، بکوشش دکتر زیب النساء علی خان، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، 2004۔
* دیوان اردو فارسی عجائب و غرائب (دیوان حضرت امجد علی شاہ قادری اصغرا کبرآبادی) مطبع جام جمشید مقام اکبرآباد محلّہ راکب گنج آگرہ [قلمی نسخہ[صفحہ ۱۰۱۸۱ ۴۶ء
* تذکرہ نتائج الافکار، محمد قدرت اللہ گوپاموی، پٹنہ بہار، 1968۔
* تذکرہ خزانہ عامرہ، میر غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور، کانپور، 1878۔
* شعر العجم، حصہ سوم، علامہ شبلی نعمانی، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2009۔
* مغلوں کے ملک الشعراء، نبی ہادی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، 1978۔
* تذکرہ نصرآبادی، میرزا محمد طاہر نصرآبادی، باتصحیح و مقابلہ استاد فقید وحید دستگردی۔
* بزم تیموریہ، جلد دوم، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2014۔
* مقالات غنی: مجموعہ مقالات، ڈاکٹر محمد عثمان غنی، لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ، 2004۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد توصیف
شعبہ فارسی،علیگرھ مسلم یونیورسٹی،علیگرھ

مسعود سعد سلمان کی فارسی شاعری بارہ ماسہ کے حوالے سے

اس دور میں فارسی زبان کا تعلق بادشاہ اور دربار سے تھا لیکن فارسی ادبی ثقافت کی دنیا صرف سیاسی اشرافیہ تک محدود نہیں تھی۔اس دور میں فارسی زبان کی وسعت کا بہترین انداز میں جو چیز ظاہر کرتی ہے وہ اس زبان میں متعدد ہندستانی الفاظ اور تصورات کی موجودگی ہے۔ مثال کے طور پر پرانی نظموں میں رانا، چندن، پانی اور تال جیسے الفاظ استعمال ہوتے تھے اور تصورات اور استعاروں کے لحاظ سے عاشق کے دانت کو یاقوت سے تشبیہ دی جاتی تھی جو اسے تمبل (پان) چبانے کی یاد دلاتا ہے۔ یا مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہوا کے جھونکے کے بجائے بارش کے بادل محبوب کو عاشق کا پیغام دیتے ہیں۔ درحقیقت مسعود کی شاعری میں بہار کا تصور بالکل بدل جاتا ہے اور وہ بہار کو ہندوستان میں بارش کا موسم مانتے ہیں اور "وصف بہار اور مدح سلطان" کے عنوان سے لکھے گئے اپنے کئی افسانوں میں وہ دراصل بارش کے موسم کو بیان کرتے ہیں:

وصف بهار و مدح سلطان محمود

به نوبهاران غواص گشت ابر هوا
که می بر آرد ناسفته لؤلؤ از دریا
به لؤلؤ ابر بیاراست روی صحرا را
مگر نشاط کند شهریار زی صحرا
زمین به خوبی چون روی دلبر گلرخ
هوا به خوشی چون طبع مردم دانا
ز سبزه گویی دریای سبز گشت زمین
درو پدید شده شکل گنبد خضرا
زمین ز گریهٔ ابر است چون بهشت نعیم
هوا ز خنده به رقص است چون که سینا
که شد به جوی درون رنگ آب چون صهبا

کنار جوی پر از جامهای یاقوت است

دوسری مثال:

وصف بهار و ستایش سیف الدوله مسعود

مگر مشاطهٔ بستان شدند باد و سحاب

که این ببستش پیرایه و آن گشاد نقاب

به در و گهر آراسته پدید آمد

چو نوعروسی در کله از میان حجاب

بر آمد ابر به کردار عاشق رعنا

کشیده دامن و افراشته سر از اعجاب

ز چرخ گردان دوالبوار آب روان

به گاه و بیگه آری چنین بود دوالب

وباز درمثالی دیگر:

بر شکال ای بهار هندوستان

ای نجات از بلای تابستان

دادی از تیر مه بشارتها

باز رستیم از آن حرارتها

هر سو از ابر لشکری داری

در امارت مگر سری داری

اس طرح، بہار کو ایک نیا تصور ملا جس نے اپنے ساتھ ہندوستان میں فارسی شاعری کی ادبی روایت کے لیے آزادی کو شامل کیا۔ بعد میں اور 14ویں صدی عیسوی کے آغاز میں امیر خسرو کی نظموں میں یہ آزادی یا ہندوستانی شناخت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ خسرو شاعری کی تقریباً تمام شکلوں اور اصناف میں منفرد تھے۔ وہ پیروکار نہیں تھے بلکہ ایک جدت پسند تھے جنہوں نے اپنے سے پہلے کیمتقد مین کی روایات کی بنیاد پر اپنا اسلوب تخلیق کیا اور اپنے بعد ہندوستانی شاعروں کے لیے نمونہ چھوڑا۔ خسرو کو ایسی شہرت اور مرتبہ حاصل تھا کہ ہندوستان سے باہر بھی کچھ بڑے شاعر جیسے جامی (1492ء) ان کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یہاں جو بات بہت اہم ہے وہ ہے خسرو کا اپنے ایک ہم عصر عبید کے بارے میں ردعمل۔ جب عبید نے نظامی گنجوی کے خمسہ (1207–1140) کے جواب میں خسرو کی لکھی ہوء مثنوی کے نقائص کا

اظہار کیا تو کہا جاتا ہے کہ خسرو نے اسے سخت جواب دیا:

شکــر مـصــری نـدارم کـز عــرب گـویـم سـخـن

تــرك هــنــدستــانيــم در هــنــدوی گــويــم جــواب

دوسرے لفظوں میں، خسرو اپنی فارسی زبان کو ہندوی زبان کے برابر سمجھتا ہے، اور یہاں تک کہ اس شعر ''چو من طوطی ہندم ار راست پرسی/ زمن ہندوی پرس تا نغز گویم؛'' میں بھی وہ ہندوی زبان میں اپنی مہارت پر فخر کرتا ہے اور اپنی فارسی زبان کو ہندی یا ہندوستان کی زبان مانتے ہیں۔

مسعود کی شاعری میں ہم کسی حد تک فارسی زبان کے ہندوستانی ہونے کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مسعود کے کچھ کارناموں میں سال کے بارہ مہینے (فارسی مہینے)، مہینے کے تیس دن (فارسی دن) اور ہفتے کے سات دن بیان کیے گئے ہیں۔ سال کے بارہ مہینوں سے متعلق گانے بارہ ماسہ (بارہ مہینوں کا چکر) کہلاتی ہیں جو پورے شمالی ہندوستان میں قرون وسطی کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ آسمانی اجسام کی حرکت اہم ہے کیونکہ یہ ایسے حالات پیدا کرتی ہے جس میں مختلف جذبات کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ بارہ ماسہ کو بنیادی طور پر دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک اس ماسہ کے بارے میں جو صرف دیہاتی زبانی روایات سے نمٹتے ہیں اور دوسرا ادبی ماسہ کے بارے میں۔ ماسہ کے بارے میں مہینوں کی ترتیب بنیادی اجزاء ہے لیکن اس میں مہینوں کی تعداد بارہ مہینے ضروری نہیں ہے۔ چار ماہ یا چھ ماہ اور آٹھ ماہ کے نام سے مشہور نغمے، جن کا مطلب بالترتیب چار، چھ اور آٹھ ماہ کا چکر ہے، بھی ماسہ کے بارے میں اسی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے نغمے بعض اوقات صرف موسمی تہواروں کی فہرست دیتے ہیں اور درحقیقت ہم انہیں ایک کیلنڈر کے طور پر مان سکتے ہیں۔ بارہ ماسہ کی نظمیں سادہ گیت ہیں جو مہینوں کے گزرنے اور موسموں کے احساس کو گہرے ذاتی احساسات کے تناظر میں بیان کرتی ہیں۔ یہ نوع اوقات کا اندازہ لگانے کے لیے ایک خاص طریقہ رکھتی ہے، جس میں وقت کی مخصوص اصطلاحات بالکل استعمال نہیں ہوتیں، اور وقت کی قدر کا تعین اس کے جذبات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، یعنی وقت ذاتی تجربے کے دائرے میں ڈھلتا ہے۔

جین مت میں بارہ حمد کے نام سے ایک تصنیف بھی ہے جو دہرم سوری نامی جین بابا کے بارے میں ہے اور مسعود سعد کے فارسی ماسہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ بارہ نواؤ، جس کا مصنف نامعلوم ہے، ایک تیرہ بندوں پر مشتمل نظم ہے جسے حال ہی میں گجرات کے علاقہ پٹن شہر میں دریافت ہونے والے ایک مخطوطہ کے نسخے سے نظر ثانی کی گئی ہے، جو بارہویں صدی کے اواخر کی ہے۔ بارہ ماسہ کے انداز میں لکھا گیا یہ کام فرزانہ جین دہرم سوری کی تعریف ہے۔ پہلا بند اس کا تعارف کراتے ہیں: "اور اب تینوں جہانوں کے زیور دھرم سوری کی تعریف سنو۔" پہلے اور آخری بندوں میں ساون (جولائی اگست) کے مہینے کی وضاحت کی گئی ہے اور ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جیسے نیلوفر آبی، (گل یاس) چمیلی کے پھول، ابر، ناچتے مور وغیرہ، اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ شامی دھرم کی بات کی جا رہی ہے، جس کی عظمت " کیونکہ یہ سورج ہے " اور پھر بہادون (اگست) کے مہینے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کے تمام حصوں میں (structure paratactic) ساخت کا استعمال کیا گیا ہے

اوراس نظم میں سال کے مہینوں اورشامی مذہب کے فضائل کو یکجا کیا گیا ہے۔

فارسی مہینوں، فارسی دنوں اور مسعود کے ہفتہ کے دنوں کی نظمیں بالترتیب بارہ،سی ہفت یعنی ۳۷ بند کی نظمیں ہیں جو سلطان کی تعریف میں لکھی گئی ہیں۔اگرچہ بارہ نواؤاس کے تدوین کنندہ کے مطابق بارہ ماسہ کی سب سے قدیم مثال ہے،لیکن بظاہر سچ یہ ہے کہ یہ نظم بارہ ماسہ کی قدیم ترین مثال ہے جو ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک میں لکھی گئی تھی۔مسعود کی فارسی نظمیں تقریباً گیارہویں صدی کے آخر میں لکھی گئیں۔بظاہر،مسعود نے ہندوستانی شاعری کی ایک پرانی روایت پرمبنی اپنی نظمیں لکھیں،یعنی سنسکرت کی ایک قسم جسے رتو ورنن(Ritu varnan) کہا جاتا ہے، جو ہندوستانی سال کے چھ موسموں کی تفصیل ہے۔یہ قسم ہندوستانی موسموں کو بیان کرتی ہے اوراس میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ محبت کی لذتوں کا فطرت کے بیان سے مستقل تعلق ہے۔بہرحال،مسعود کی فارسی بارہ ماسہ ہندوستان میں لکھی جانے والی تاریخ کی سب سے پرانی مثالیں ہیں۔مسعود کے قصیدے کی خوشی کے رنگین بیانات ہیں جو سال کے بارہ مہینوں، مہینے کے تیس دن اور ہفتے کے سات دنوں کے نجومیوں کی خصوصیات سے ہم آہنگ ہیں۔مسعود کے مطابق،سلطان کی تعریف کی جانی چاہیے،کیونکہ اس کی سخاوت،انصاف،اور اس کی حکمرانی کی صلاحیت کی وجہ سے،دنیا جنت میں بدل گئی ہے۔ستاروں کے اثر سے قطع نظر،وہ برے ہوں یا نیک،دنیا خوشیوں سے بھری ہوئی ہے،اس لیے سلطان کی تعریف کرنی چاہیے۔ان اشعار کا مزاج خواشی واورمسرت ہے۔

اردی بہشت ماہ

بهشت است گیتی ز اردی بهشت
حلال آمد ای مه می اندر بهشت
به شادی نشین هین و میء خواه می
که بی می نشستنت زشت است زشت
به راغ و به باغ و به کوه و به دشت
ز فر گرانمایه اردی بهشت
بخندید گلزار و بگریست ابر
بنالید مرغ و ببالید گشت
بسی کله یابی که رضوانش یافت
بسی حله بینی که حوراش رشت
تو گویی که ملك ملك ارسلان
گل و عنبر و مشك در هم سرشت

جهاندار شاهی که چرخ بلند

به ملکش یکی عهد محکم نبشت

بہمن ماہ

ماه بهمن نبید باید خورد

ماه بهمن نشاط باید کرد

در جهان هر که هست فرزانه

به پسندد نشاط جانپرورد

زآنکه امروز مطرب و ساقی

رود و باده به بزم شاه آورد

شه ملك ارسالن بن مسعود

شاد بنشست و باده خواهد خورد

آنکه رادی چو او نیارد راد

وآنکه مردی چو او نبیند مرد

خسروا تا جهان ز مهر و ز چرخ

گه شود گرم و گاه گردد سرد

گاه بر دوستان چو مهر بتاب

گاه بر دشمنان چو چرخ بگرد

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، قرون وسطی میں، بارہ ماسہ کی نظمیں ہندوستانی لوک داستانوں کا حصہ بن گئیں جنہیں بِرھا کہا جاتا ہیاور بنیادی طور پران کا استعمال شدید جذبات کے اظہار کے لیے کیا جاتا تھا۔ان میں سے زیادہ تر نظموں میں ایک نوجوان عورت کو دکھایا گیا ہے جو جدائی کے درد سے گذر رہی ہے اور سال کے بارہ مہینوں میں اپنے محبوب کی واپسی کا بے صبری سے انتظار کر رہی ہے۔اس بارہ ماسہ میں فطرت کی تفصیل محبوب کے دکھ اور درد کی تفصیل سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ یہ نغمے عام طور پر خواتین کے گیت ہیں جن میں برسات کے چار مہینوں یعنی محبت و دوستی اور تجدید کے موسم کی اہمیت سال کے دیگر مہینوں سے زیادہ ہے۔قرون وسطیٰ میں ہندو اور مسلم صوفی شاعروں کی تخلیق کردہ فولکلور (folklore) میں بھی بہت سے بارہ ماسہ شامل تھے، جو کہ خاص طور پر "اخلاقی" قسم کے تھے۔اس کا اطلاق منگل (خوشی کی حالت میں گانے والا نغمہ) کے نام سے مشہور نظموں پر ہوتا ہے جو قرون وسطیٰ کے بنگال میں عام تھیں اور صوفیانہ مثنوی جو کہ ہندوی زبان

میں جو 14 ویں صدی کے بعد سے پریم اکھیانہ روایت میں استعمال ہوتے رہے ہیں، اوران میں سب سے زیادہ معروف ملا داؤد کی متعدد تخلیقات کے مثنوی ہیں۔

یہ بات اہم ہے کہ قرون وسطیٰ کے ہندی بولنے والے فارسی شاعروں میں سے کسی نے بھی اس سلسلے میں مسعود کی پیروی نہیں کی اور نہ ہی ایسی نظمیں لکھیں۔یہی وہ دور تھا جب مسعود کی شاعری کا یہ پہلو ہند-فارسی ادبی روایت سے مکمل طور پر ہٹا دیا گیا تھا،شاید اس لیے کہ فارسی زبان، یعنی دربار کی زبان اور شہر میں عام زبان، دیہی ہندوستانی شاعرانہ روایت سے تعامل کے لیے برتر نظر آتی تھی۔مسعود کی ہندی نظموں میں سے کچھ نہیں بچا۔ان اشعار میں غالباً بارہ، چار ماسا، چھ مسا اور آٹھ ماسا شامل تھے، اس کے علاوہ، مسعود نے ہندی میں "بہار کے گیت" (پہا گو یا بسنت) لکھے ہوں گے۔تاہم یہ سب محض قیاس آرائیاں ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر مبشرہ صدف

صدر شعبہ اردو، ایم ڈی ڈی ایم کالج، بی آر اے بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار

شہر یار کی شاعری میں تہذیبی حسیت اور عصری شعور

شہر یار کا شمار معاصر اردو غزل کے اُن ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے جدید حسّیت کے باوجود کلاسیکی روایت کی تہذیبی خوشبو کو برقرار رکھا۔ ان کی غزلیں ایک طرف نئی شاعری کی فکری جدّت سے وابستہ ہیں اور دوسری طرف کلاسیکیت کے اُس داخلی آہنگ کو بھی زندہ رکھتی ہیں جو اردو غزل کی بنیاد ہے۔ فکری و فنی سطح پر شہر یار کے ہاں ایک ایسا تازہ اور منفرد رنگ نمایاں ہوتا ہے جو انہیں اپنے ہم عصر شعرا میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔ غزل چونکہ اثر پذیری کی صنف ہے، دلوں کو مسحور اور ذہنوں کو روشن کرنے والی، لہٰذا شہر یار کی غزلوں میں یہ جوہری خوبی پورے وقار اور لطافت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کے یہاں معنی آفرینی، مضمون تراشی اور اثر انگیزی ایک ایسی ہم آہنگ سطح پر ملتی ہیں جو اُن کے شعری مزاج کی انفرادیت پر دلالت کرتی ہے۔ یہی امتیاز انہیں معاصر غزل کے صفِ اول کے شاعروں میں شامل کرتا ہے اور اردو غزل میں ایک منفرد اور پائیدار مقام عطا کرتا ہے۔

شہر یار کی غزل ان کی مخصوص طبعِ شعری کا آئینہ ہے۔ وہ اپنے عہد کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں اور اس کے دکھ، اضطراب، بے سمتی اور معنوی خلاؤں کو نہایت سلیقے سے لفظوں میں ڈھالتے ہیں۔ ساتھ ہی، وہ کلاسیکی اصولوں اور غزل کی روایتی جمالیات سے بھی گہرا رشتہ برقرار رکھتے ہیں، جس کے باعث ان کی غزل نہ صرف جدید ہے بلکہ روایت کے تسلسل میں بھی جاگی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں سوز و اثر کی کیفیت کے ساتھ معنی کے ایسے متعدد دریچے وا ہوتے ہیں جن تک کم ہی شعرا کی نگاہ پہنچی ہے۔ شہر یار کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جو ان کی غزل کی فکری لطافت اور معنوی گہرائی کی خوبصورت مثال ہیں:

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے
اب جدھر دیکھئے لگتا ہے کہ اس دنیا میں
کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے
عجب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سایے سے کل رات ڈر گیا یارو

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر یار نے اپنے عہد کے داخلی تجربے اور بیرونی حقیقت کو نہایت سادگی مگر گہرائی کے ساتھ برتا ہے۔

پہلے شعر میں عصرِ حاضر کے انسان کی وجودی کیفیت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے—وہ انسان جو خواہشات کی تکمیل کے باوجود کسی نہ کسی کمی کے احساس سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے۔ زندگی کے معاشی، سماجی اور نفسیاتی تقاضوں نے اسے ایک ایسی بےکلی میں مبتلا کر دیا ہے جہاں حصول کے بعد بھی عدمِ تکمیل کا شعلہ بجھنے نہیں پاتا۔ یہ ذمہ داریاں اسے ایک ایسے دائرے میں محصور رکھتی ہیں جہاں ہر کامیابی کے باوجود کچھ نہ کچھ " کم" رہ جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں یہ کمی ایک وسیع تر منظرنامے تک پھیل جاتی ہے۔ یہاں شاعر نے دنیا کی ناہمواری اور بےترتیبی کو بیان کیا ہے۔ وہ عدمِ توازن جو دراصل انسان ہی کی پیدا کردہ ہے۔ انسانی انتخاب، اس کی ترجیحات، اور اس کے عمل کے نتائج ایک ایسی دنیا تشکیل دیتے ہیں جہاں زیادتی اور کمی کا توازن بسا اوقات بگڑ جاتا ہے اور ایک ایسی کائناتی بےسمتی پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر نے اپنی ذات کے اندر خوف کی کیفیت کو علامتی سطح پر پیش کیا ہے۔ یہ محض ظاہری خوف نہیں بلکہ اپنے ہی وجود کے باطن سے دہشت زدہ ہو جانے کی شدید کیفیت ہے— گویا انسان وہی بن گیا ہے جس سے وہ خود خوف کھاتا ہے۔ فرائیڈین نفسیات میں سایہ لاشعور کی علامت ہے، اور شہریار اسے شاعری کی لطیف زبان میں وجودی گھبراہٹ کا تہہ دار استعارہ بنا دیتے ہیں۔ یہ دراصل اُن اجتماعی حالات کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے انسان کو داخلی طور پر عدمِ تحفظ اور اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ فرد خود اپنے وجود سے بھی خائف محسوس ہوتا ہے۔

شہریار نئی غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں معاصر غزل کی تمام فنی و جمالیاتی خوبیاں موجود ہیں، مگر اس کے باوجود ان کا داخلی رشتہ کلاسیکی غزل سے نہ صرف مستحکم ہے بلکہ اسے برقرار رکھنا وہ اپنے لیے ایک جمالیاتی اور تہذیبی قدر بھی سمجھتے ہیں۔ فکر و خیال کی سطح ہو یا زبان و بیان کی ساخت— شہریار کی غزلیں ایک منفرد رنگ اور مخصوص داخلی آہنگ رکھتی ہیں، اور یہی انفرادیت انہیں معاصر غزل کے اہم ترین شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔

یہ کہنا بجا ہے کہ شہریار نے اپنے لہجے کی لطافت، اسلوب کے توازن اور ہیئتی تجربات کے ذریعے کلاسیکی اردو غزل کی روایت کو نئی توانائی عطا کی۔ معاصر غزل کے تناظر میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ جدید غزل، جدیدیت کی فکری اساس پر قائم ہے۔ بظاہر یہ درست بھی ہے کہ نئی غزل نے جدیدیت کی فکری تحریک سے بہت کچھ حاصل کیا، تاہم یہ دعویٰ درست نہیں کہ معاصر غزل تمام تر جدیدیت ہی کی نمائندہ ہے۔ آج کی غزل مختلف فکری جہات اور تہذیبی رجحانات کا امتزاج ہے، اور اسی تنوع نے اسے ایک ہمہ گیر معنویت عطا کی ہے۔

شہریار نے اپنی شاعری میں مختلف فکری رویّوں سے استفادہ کیا، لیکن انہیں محض جدیدیت کا شاعر کہنا درست نہ ہوگا؛ زیادہ مناسب یہ ہے کہ انہیں جدید لب و لہجے کا شاعر کہا جائے—وہ شاعر جس نے روایت اور جدت کے بیچ ایک نادر توازن پیدا کیا۔

ان کے چند اشعار دیکھیے جن میں انسان کی بے پناہ طاقت اور وجودی وسعت کا اشارہ بھی ہے اور داخلی تجربے کی تہہ داری بھی۔ یہاں نہ تو شکست خوردگی کا سایہ دکھائی دیتا ہے، نہ مایوسی کا جبر؛ بلکہ ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جو موجودہ زمانے کے حالات کو ایک نئے رنگ میں

پیش کرتا ہے:

ہوا سے الجھے کبھی سایوں سے لڑے ہیں لوگ
بہت عظیم ہیں یارو، بہت بڑے ہیں لوگ

اور ایک اور شعر جس میں انسانی کے باطنی خلا اور ازلی جستجو کو نہایت سادگی اور تہہ داری سے بیان کیا گیا ہے:

نہ جس کا نام ہے کوئی نہ جس کی شکل ہے کوئی
ایک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

جدید غزل میں سماج بیزاری اور تنہائی کے عناصر نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں، مگر جب ہم شہریار کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ان کی غزلیں روایتی معنوں میں سماج بیزاری کا شکار نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ سماج کے اُن مخصوص رویّوں اور نظریوں سے بے زار دکھائی دیتی ہیں جن کی بنیاد فریب، جھوٹ اور دورنگی پر استوار ہے——وہ عوامل جو انسانی وجود کو مایوسی، کرب اور روحانی فرسودگی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

شہریار کی شاعری میں داخلیت، انفرادیت اور اظہارِ ذات کی لطیف کیفیتیں مسلسل جلوہ گر ہیں۔کہیں حقیقت سے ایک ہلکا سا گریز ملتا ہے، کہیں فرار کی خواہش ذہن کو چھوتی ہے، تو کبھی غم سے ایک لطیف، جمالیاتی انس منکشف ہوتا ہے۔یہی ملے جلے احساسات ان کی غزل کے مزاج کو نہایت خاص اور معاصر حسّیت کا ترجمان بنا دیتے ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی نہیں
سینے میں جلن، آنکھ میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے
گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

آج کا عہد اپنے مزاج، رفتار اور فکری جہات کے اعتبار سے ماضی کے تمام ادوار سے یکسر مختلف ہو چکا ہے۔انسان نے مادی آسائشوں، سائنسی ترقی اور علوم وفنون کی فراوانی کے باوجود ایک ایسی داخلی کسک کو جنم دیا ہے جو احساسِ محرومی کی صورت ہر لمحہ اس کا تعاقب کرتی ہے۔یہ خلش شاید اسی تیز رفتار ترقی کا نتیجہ ہے جس نے انسان کو بنیادی انسانی قدروں، روحانی سکون اور داخلی توازن سے بتدریج دور کر دیا۔نتیجتاً وہ مادی سہولتوں کی کثرت کے باوجود تنہائی، بے معنویت اور وجودی بے سمتی کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

شہریار کی شاعری میں اسی نفسیاتی اور سماجی بحران کی پرتیں جا بجا محسوس ہوتی ہیں۔ چاہے انسان کے پاس دنیا کی تمام تر سہولتیں موجود ہوں یا وہ معاشی محرومی کا سامنا کر رہا ہو—اسے بہرحال یہ سوال اپنی طرف کھینچتا ہے کہ اس دنیا میں اس کی انفرادیت کیا ہے، اور اس کی داخلی ذات کا مقام کہاں ہے۔ مادہ پرستی کی دوڑ اور میکانیکی طرزِ زندگی نے فرد کو یوں مجتمع کر دیا ہے کہ اس کی انفرادی حیثیت، داخلی شناخت اور ذاتی تجربہ دھندلا کر رہ گیا ہے۔ آج ہر شخص کا مقصد تقریباً یکساں ہے: زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول اور بہتر مادی آسائشوں تک رسائی۔

شاعر بھی اسی سماجی دھارے کا حصہ ہے، مگر اس کی طبیعت کی لطافت اور حساسیت اسے دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ وہ نہ صرف بیرونی دنیا کے حالات کو شدت سے محسوس کرتا ہے بلکہ اپنی انفرادی شناخت کی حفاظت کے لیے بھی ہمہ وقت فکرمند رہتا ہے۔ یہی کیفیت شہر یار کی غزلوں میں مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار دیکھئے:

اپنی مرضی ہے، کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں
اس سفر میں بس میری تنہائی میرے ساتھ تھی
ہر قدم کیوں خوف مجھ کو بھیڑ میں کھونے کا تھا

یہ اشعار شہر یار کے اس داخلی اضطراب، تنہائی کے شعور اور وجودی تلاش کو نہایت موثر انداز میں بیان کرتے ہیں، جو عصرِ حاضر کے انسان کی اجتماعی ذہنی کیفیت کا عکاس ہے۔ یہ ایک تلخ مگر بنیادی حقیقت ہے کہ آج کا انسان زیادہ تر اپنے مفاد کے دائرے میں جیتا ہے۔ وہ اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی خوشیوں کے حصول کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتا ہے، حتیٰ کہ اس جدوجہد میں مادی آسائشیں ہی اس کی زندگی کا مقصد محسوس ہونے لگتی ہیں۔ مگر مفاد پرستی کی یہی روش انسان کو ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کیا زندگی کا مقصد صرف مادی آسائشوں کی تسخیر ہے؟ کیا روحانی سکون، انسانی رشتوں کا باہمی احترام، اور اخلاقی قدریں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہیں؟

شاعر چونکہ حسیات اور شعور کے زیادہ لطیف زاویے رکھتا ہے، اس لیے وہ اس بحران کو عام انسان کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ مفاد کی حرص میں اپنے ہی تانے بانے بکھیر رہا ہے، انسانی رشتوں کی حرمت پامال ہو رہی ہے، اور انسانیت خود اپنے ہی ہاتھوں شرمسار ہو رہی ہے، تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے:

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنا لے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

یہی احساس معاصر غزل کی تہہ میں بھی نمایاں ہے۔ نئی تہذیبی ساخت اور بدلتی ہوئی اقدار کے دباؤ نے ہماری قدیم اور بنیادی قدروں کو پامال کر دیا ہے۔ انسان جو فطرتاً معصوم، سادہ اور غیر پیچیدہ تھا، شہری زندگی کی تیز رفتاری اور مادہ پرستی نے اس کی سادگی کو نگل لیا۔ تاہم، ان تمام تبدیلیوں کے باوجود کبھی کبھی شہر کے شور و غوغا میں اسے گاؤں کی سادگی اور سکون یاد آ جاتا ہے۔ غزل میں ان تجربات کو نہایت

لطافت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر شہری فرد کو گاؤں کی یاد ستائے؛بعض کے لیے شہر ہی اپنی تمام تر بے مہری کے باوجود آرام کا واحد مرکز ہوتا ہے۔چنانچہ شہریار نے شہر کے حوالے سے ایک حقیقت پسندانہ نقشہ یوں کھینچا:

شہر پھر شہر ہے یاں بھی تو بہل جاتا ہے
شہر کو چھوڑ کے صحرا میں نہ جا، مان بھی جا

معاصر شعرا نے زندگی کے متفرق تجربات اور فکری زاویوں کو نہایت انفرادیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ سماج کے بیشتر مسائل ہماری اپنی ہی پیدا کردہ پیچیدگیوں کا نتیجہ ہیں۔مادی آسائشوں کی دوڑ،ظاہری نمود و نمائش،اور ہیئتی زندگی کی مصنوعی اقدار نے انسانی وجود پر جو نفسیاتی بوجھ ڈالے ہیں،ان سے گھبراہٹ،خوف اور غیر یقینی کی کیفیت جنم لیتی ہے۔یہ خوف صرف باطنی یا ذاتی نہیں بلکہ بیرونی دنیا سے بھی ایک مسلسل ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔شہریار نے اپنی غزلوں میں اس داخلی و خارجی کشمکش کو بڑے لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے۔مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار دیکھیے،جن میں زندگی کی بے ثباتی،سفر کی ناتمامی،اور وجودی بے سمتی کی گونج واضح ہے:

اپنی مرضی ہے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں
اس سفر میں بس میری تنہائی میرے ساتھ تھی
ہر قدم کیوں خوف مجھ کو بھیڑ میں کھونے کا تھا

یہ تمام کیفیتیں اسی بڑی حقیقت سے جنم لیتی ہیں کہ انسان—خواہ وہ کہیں بھی ہو—اپنے مفاد،اپنے تحفظ،اور اپنی تنہا ذات کی تکمیل کے لیے ہر سمت بھاگتا ہے۔یہاں تنہائی محض فردیت کا مسئلہ نہیں،بلکہ جدید سماج کا علامتی بحران ہے—وہ سماج جہاں بھیڑ میں رہ کر بھی انسان خود کو غیر مرئی محسوس کرتا ہے۔یہی خوفِ گمشدگی مابعد جدید فکر کا بنیادی محرک ہے۔آخرکار،یہ تمام تجربات دوبارہ اسی بڑے سوال پر آ کر مرکوز ہوتے ہیں کہ انسان اپنی حرص و ہوس کے اندھیرے میں کہاں تک بھٹکے گا؟

مگر جب شاعر اس بھاگ دوڑ میں انسانیت کی شکست دیکھتا ہے،تو وہ اسی طرح کی صدائے درد بلند کرتا ہے:

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنا لے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

معاصر شعرا نے زندگی اور اس کے تہہ دار تجربات کو ایک منفرد نظریاتی زاویے سے برتا ہے۔وہ بخوبی آگاہ ہیں کہ سماج میں در آنے والے بیشتر مسائل ہماری اپنی ساختہ پیچیدگیوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں۔مادی آسائشوں کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور ظاہری ہیئت پر استوار طرزِ زندگی نے انسانی وجود پر جو گہرے اثرات مرتب کیے ہیں،اُنہوں نے حیاتِ انسانی کے اندروں میں ایک مستقل اضطراب اور بے

نام خوف کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہ خوف نہ صرف انسان کے باطن سے ہم آغوش ہے بلکہ اس کے بیرونی تجربات کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔اسی وجودی بے چینی اور نفسیاتی شکستہ حالی کے تصور کو شہریار نے اپنی غزلوں میں نہایت لطیف، مگر گہرے فکری شعور کے ساتھ پیش کیا ہے:

ہر شخص مضمحل ہے بکھرنے کے خوف سے
آندھی کا قہر سرو و صنوبر پر دیکھ کے

یہ شعر دراصل اس اجتماعی کیفیتِ اضطراب کی علامت ہے جس میں ہر فرد اپنے اندر کسی نہ کسی نامعلوم شکست کے اندیشے کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور ہے۔آندھی کا قہر محض ایک فطری منظر نہیں بلکہ وقت، سیاست اور معاشرت کی بیرحمانہ آندھیاں ہیں، جن کا سامنا کرتے ہوئے سرو و صنوبر جیسی استقامت رکھنے والی ہستیاں بھی متزلزل ہو جاتی ہیں۔شہریار کے ہاں خوف کا یہ اظہار محض ایک شخصی فریاد نہیں، بلکہ اپنے زمانے کے وجودی بحران کی ایسی گہری تفہیم ہے جو قاری کو ناگزیر طور پر اپنی باطنی ٹوٹ پھوٹ اور خاموش بیچارگی کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

زبان و بیان کے تناظر میں اگر شہریار کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو وہ واضح طور پر نئی غزل کی روایت سے قریب تر دکھائی دیتی ہے۔معاصر غزل میں شاعر جس طرح فکر و خیال کے دائرے میں آزاد ہے، اسی طرح اسے لفظیات کے انتخاب میں بھی بیشمار امکانات میسر ہیں۔یہی آزادی کبھی کبھی زبان و بیان کی سطح پر ایک طرح کی انتہاپسندی کو جنم دیتی ہے۔کلاسیکی لفظیات سے ہماری دیرینہ شناسائی اس قدر ہے کہ نئی اور غیر روایتی لفظیات کو قبول کرنے میں اکثر ہمیں مانوسیت کا بحران لاحق ہو جاتا ہے۔معاصر غزل میں ایسے الفاظ کی بہتات ملتی ہے جو کلاسیکی روایت کا حصہ نہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قاری کو بعض مقامات پر ان الفاظ میں اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔

تاہم شہریار کی شاعری اس تناظر میں ایک متوازن اور جمالیاتی مثال پیش کرتی ہے۔ان کے ہاں نئی لفظیات کی جدت اور کلاسیکی شعری آہنگ کی تہ داری ایک ساتھ موجود ہے، جس سے ان کا تخلیقی تجربہ نہ صرف جدیدیت کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے بلکہ غزل کی روایتی لطافت بھی برقرار رہتی ہے۔

جا بجا سرخ بلب روشن ہیں
اور گوشیوں کا شکریہ

اس طرح شہریار نے معاصر اردو غزل کو فکری و فنی سطح پر ایک نیا وقار اور ایک نئی سمت عطا کی ہے۔

اب میں اپنے مقالے کا اختتام شہریار کے چند منتخب اشعار سے کرتی ہوں، جو ان کی شعری جہت کو مزید واضح کرتے ہیں۔:

پچھلے سفر کی گرد کو دامن سے جھاڑ دو
آواز دے رہی ہے کوئی سونی راہ پھر

آغاز کیوں کیا تھا سفر ان خوابوں کا
پچھتا رہے ہو سبز زمینوں کو چھوڑ کے

محمد عاصم
خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ

مکتوبات مخدوم حسین نوشہ توحید

حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید وسمندر توحید نویں صدی ہجری کے متبحر عالم اور سر برآوردہ بزرگان سلسلۂ فردوسیہ میں شمار ہوتے ہیں۔علم فضل میں منفرد،طریقت ومعارف اورعرفان وتصوف میں یگانۂ روزگار تھے۔سلسلۂ فردوسیہ آپ کی جامع کمالات شخصیت سے جاری و ساری ہے۔حضرت مخدوم جہاں کے آپ دست گرفتہ،مخدوم مظفر بلخی کے برادرزادہ اوران کے پروردہ وبرداختہ تھے۔

آپ کا عہد میمون آٹھویں صدی ہجری کے اواخر سے نویں صدی ہجری کے اوائل نصف اول پر مشتمل ہے۔سن ولادت کے ذکر سے تاریخی مآخذ خالی ہیں؛البتہ سن وفات ۲۴ذی الحجہ 844ھ متحقق ہے۔آپ کے معاصرین مشائخ صوفیا میں شیخ علاءالحق پنڈوی،نور قطب عالم پنڈوی، شیخ سید بدیع الدین،خواجہ گیسودراز اورشیخ حسام الدین مانک پوری وغیرہ اہم ترین بزگان ہیں نیز شاہان معاصرین میں فیروز شاہ تغلق،ملک الشرق خواجہ جہاں،ابراہیم شرقی اورمحمود شاہ شرقی،غیاث الدین بنگالہ کے اسامی قابل ذکر شمار کئے جاتے ہیں۔

مخدوم حسین کے اکتساب علمی کا سلسلہ عرب وعجم پر محیط ہے۔عرب وعجم کے مشاہیر علماء وفضلائے زمانہ جیسے شیخ شمس الدین خوارزمی،شمس الدین حلوائی،مولانا سعدالدین جونپوری اورمخدوم مظفر بلخی سے شرف تلمذ حاصل رہا اکتساب علمی کی فراغت سے لے کرآخری ایام حیات تک کاسبین وسالکین طریقت کی تربیت وتعلیم کے ساتھ علوم ظاہری کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا تفسیر واحادیث میں آپ کو بے پایاں کمال حاصل تھا،آپ کے حلقہ درس سے اپنے زمانے کبارمشائخ نے اکتساب علم کیا،آپ کے حلقہ درس میں علوم متداولہ کی تمام کتابیں زیدرز یردرس ہوا کرتی تھیں،قران وتفسیر،حدیث،فقہ اورعلم کلام ان میں خاص طور پرز یردرس رہے۔

شیخ حسین نوشہ توحید کی ابتدائی تربیت روحانی حضرت مخدوم جہاں کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد آپ سے شروع ہوئی،پھر مظفر بلخی نے آپ کی تربیت کی تکمیل فرمائی،اجازت سلاسل اوراپنی جمیع مرویات کا مخدوم حسین کومجاز بنایا،یہ حضرت مخدوم جہاں کی پیشین گوئی تھی کہ مخدوم حسین سے مخدوم مظفر کا روحانی وعلمی سلسلہ جاری وساری رہے گا،یہ بات بالکل عیاں اورروشن ہے کہ آج تمام طرق فردوسیہ میں حضرت مخدوم حسین کی جامع شخصیت شیخ واسطہ کی حیثیت رکھتی ہےاورآپ ہی کے ذریعے سے سلسلۂ فردوسیہ کی اشاعت ہورہی ہے۔

حضرت مخدوم حسین صاحب درس بزرگ ہونے کے ساتھ صاحب تصانیف بھی تھے،آپ کے قلم سے گراں مایہ کتابیں منصۂ شہود پرآئیں۔ان میں حضرات خمس (عربی،موضوع توحید)،رسالہ قضا وقدر(فارسی)،رسالۂ توحید خاص (فارسی)،توحید اخص الخواص،رسالہ

وجود عالم، اوراد فصلی، مجموعۂ ملفوظ گنج لا یخفیٰ ، دیوان فارسی ،مثنوی بروزن مثنوی معنوی اور مجموعۂ مکتوبات فارسی کا نام کتب تراجم میں مذکور ہوا ہے۔

مکتوبات:

حضرت مخدوم نوشہ توحید کے مکتوبات کا مجموعہ 200 ؟، ارزش مکاتب پر مشتمل ہے اس کے قلمی نسخے بہار کی چند خانقاہوں میں دستیاب ہیں، ایک مکمل نسخہ حیدرآباد کے کتب خانے میں موجود ہے، ان کے علاوہ ایک ناقص الآخر مجموعہ مکتوبات پٹنہ یونیورسٹی سنٹرل لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں بھی محفوظ ہے، سابق میں آپ کے مکمل 200 ،مکتوبات، ترجمے کے ساتھ پاکستان سے شائع ہوئے تھے، جن کی مطبوعہ کاپیاں اب نایاب ہیں، مخدوم حسین سے منسوب بہار شریف کی خانقاہ سے دوبارہ سو مکتوبات کا ترجمہ چند سال قبل شائع ہوا ہے جس میں متن شامل نہیں ہے۔ مکتوبات کی سائنٹیفک اشاعت بھی اب تک وجود میں نہیں آئی ہے۔

مخدوم نوشہ توحید کے مکتوبات نفس مضامین کے لحاظ سے علوم ومعارف کا سرچشمہ ہیں، یہ مخدوم جہاں کی تعلیمات کا نمونہ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ان کی حکیمانہ تشریحات پر مشتمل ہیں، مخدوم حسین نے ان تعلیمات کو ذاتی تجربات کے آئینے میں پیش کیا ہے شیخ کے مکتوبات کے متعلق اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"اورا نیز مکتوبات است بطرز شیخ بزرگ اعنی شیخ شرف الدین قدس سرہ متضمن اسرار توحید و باعث براختیار تجرید بہ زبانۂ لطیف ومعانۂ عجیب..." (اخبار الاخیار؛ص:۱۵۸)

مکتوبات مخدوم حسین کو آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسن دائم بلخی نے جمع وتدوین فرمایا ہے، دیباچہ مکتوبات میں الفاظ حمد و صلاۃ کے بعد تدوین وتالیف کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مـی گـویـد حسـن بـن حسیـن مـعـز بلخـی ...چـون جـمـاعتـی ...متـوجـہ آن حـضـرت شیخ حسین بـلـخی ...شدند...وحـال اشـکـال مـقـامـات بـہ رفع عرائض التماس کردند ...بـہ واسـطـۂ وصـول مکاتبات...ادراك کـردنـد، خـاك آستـانـۂ (مـخدوم حسین) اگرچہ بسبب ادبار خود از آن آفتاب محجوب ماندند، برای مریدین دوستانہ ومـعتقدان آن درگاہ ...مـکتـوبـات و رسـائـل و فـوائـد متفرقہ را جمع کرد؛تاشاید این بیچارہ را فدای راہ ایشان کنند وبرایشان بخشند..." (مجموعۂ مکتوبات قلمی)

حضرت نوشہ توحید کے مکتوبات بلحاظ مضامین قرآن واحادیث واخبار کی تفسیر وتشریح، مشائخ صالحین کے اقوال ابیات واشعار کی توضیح، مسائل شرعیہ کے احکام اوران کے مقاصد، عرفان وتصوف میں خاص طور پر مضامین توحید کی عالمانہ وعارفانہ وضاحت وتشریح اور رشد و ہدایت کی عمدہ ترین باتوں سے مملو ہیں۔ جن کے مطالعے سے صاحب مکتوبات کے مبلغ علم وعرفاں کا اندازہ ہوتا ہے نیز ان مکاتیب سے مولف مکتوبات کے حالات اوران کی صوفیانہ زندگی پر سیر حاصل تفصیلات بھی ملتی ہیں، ادبی لحاظ سے بھی مخدوم نوشہ توحید کے مکتوبات خاص

اہمیت کے حامل ہیں کہ سلسلۂ فردوسیہ کے ممتاز بزرگ حضرت مخدوم ملک کے طریقے پر چلتے ہوئے مخدوم نوشہ توحید نے بھی جہاں عرفان تصوف کی اعلیٰ ترین باتوں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے وہیں ان کے مکتوبات اٹھویں اور نویں صدی ہجری کے ہندوستان کی فارسی زبان وادب کی اشاعت میں بھی اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے، ان مکتوبات کا ایک حصہ جیسا کہ قبلاً مذکور ہوا فارسی اشعار کی صوفیانہ تشریح وتوضیح پر بھی مشتمل ہے۔ مضامین مکتوبات میں برمحل اشعار عربی و فارسی کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت مخدوم نوشہ توحید زبان وادب پر بھی عمیق نگاہ رکھتے تھے اس زمانے کی مروجہ زبان وادب اور تہذیب وثقافت کے ذریعے عرفان وتصوف اور عشق حقیقی کی دلچسپ تشریحات کرنا اس صوفی ادیب کا حق ہے جسے اسرار وحقائق تصوف سے آشنائی کے ساتھ زبان وادب سے بھی اس کا گہرا رشتہ رہا ہو، صوبہ بہار کے لئے باعث افتخار حضرت مخدوم اور ان سے تعلق رکھنے والے یہ حضرات کاملین جنہوں نے ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں فارسی اور عربی زبان وادب کی ترقی اور اس کی نشر واشاعت میں کمال درجہ قلمی تعاون فرمایا۔

مکتوبات شیخ نوشہ توحید کی جامعیت کو اس لحاظ سے بھی بخوبی احسن ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ مخاطبان نے مکتوبات میں اکثر حضرات اپنے وقت کے اصحاب علم فضل اور افتا وقضا جیسے مناسب عالیہ پر فائض رہنے والے شامل ہیں، مثلاً مولانا نورالدین، مولانا سعدالدین، قاضی قمرالدین، قاضی نصیرالدین، مولانا سمائالدین، امام حسام الدین وغیرہ کے علاوہ ملک رفیع اور سلطان ابراہیم وغیرہ کے نام بھی مخاطبان مکتوبات میں نظر آتے ہیں۔

مکتوبات نوشہ توحید میں نکات عارفانہ اور تحقیقات فاضلانہ خوبصورت اور رواں اسلوب میں پیش کی گئی ہیں، شریعت وطریقت کے تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حسب ضرورت باتیں بیان ہوئی ہیں، ان مضامین میں احکام شرع عالیہ میں خاص طور پر طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، آداب تلاوت قران، کفر وایمان اور قضا وقدر وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے، اس طرح اکرام ضیوف، اخلاق و تواضع، محافظت نفس، حقوق شریعت کی رعایت، انفاق عیال، تقلیل طعام وشراب، محتاجوں کی دستگیری، حسن اخلاق کی فضیلت، لایعنی کاموں سے احتراز اور یادحق میں مشغولی، مکر ودغائے نفس، بشارت عاصیان وغیرہ جیسے عنوانات پر عالمانہ اور ناصحانہ انداز میں خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے، اس طرح طریقت کے باب میں مثلاً توحید، فنا وبقا، مبداء ومعاد، وجود عالم، تجرید، ومشاہدۂ حقیقت، انواع معرفت، مراتب انسان، روش مردان وشرائط صحبت، تسلیم وتفویض، محاسبۂ نفس، پاسبانی دل، مجاہدہ، مروت و فتوت، خودی و بے خودی، شوق واشتیاق، استقامت، توبہ، اسرار نماز، شریعت، حضوریٔ دل، مشغولیٔ ذکر، معنیٔ ذکر، اعمال اہل دنیا واہل اخرت، اہل اللہ کی ہمت وتوجہ، توکل، معنی دنیا، نیت، حسرت برمعصیت، دوستان حق، درویشوں سے حسن اعتقاد، احوال عاشق، وجد ومستی، شراب وحدت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حضرت مخدوم نوشہ توحید کے مجموعہ مکاتیب کا ہر ایک مکتوب اس نوعیت کا حامل ہے کہ ہر ایک مکتوب پر تفصیلی گفتگو کی جائے، ان کا ہر ایک بیان عالمانہ اور فاضلانہ تشریحات سے مملو ہے، چند نمونے سطور ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

آیت: وانک لاجرا غیرممنون:

حضرت مؤلف قدس سرہ تیرہویں مکتوب میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے سائل کے جواب کے مطابق اولاً تفسیر زاھدی اور رسالۂ قشریہ کے حوالے سے مذکورہ لفظ ''میمون'' کی تشریح لفظ ''منقوص'' سے کی ہے اور پھر اس پر یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ یہاں نقصان کو قسم کامل نہ قرار دے بلکہ قسم تمام قرار دے پس دوسروں کے حق میں نقصان کو قسم کامل جانے اور حضور کے حق میں کہیں: انک لا جرا غیر ممنون ای غیر منقوص بمعنی انہ غیر مہتم و مالایظہر تمامہ یکون ابدیاً دائماً واللہ اعلم ۔

ارزل العمر پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت:

چ بیسویں مکتوب میں ثم رددناہ اسفل سافلین کی تفسیر کے تحت معنی؟ ارذل عمر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ارذل العمر اسے کہتے ہیں جس سے دین کا کوئی کام اس سن میں اس سے نہیں سنور سکتا، ایک جگہ بڑا ہوا درماندہ ہو۔ جن لوگوں کو اللہ تعالی نے ارزل العمری تک پہنچا دیا ہے وہ جوانی میں جیسا ایمان رکھتے ہیں بڑھاپے کی حالت میں بھی وہ عابدوں میں شمار رہیں گے؛ اگر چہ عمل سے بالکل بے کار ہو گئے ہوں ابناء ثمانین عتقاء اللہ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ 80، سال کیلگ بھگ کے لوگ اللہ کے نزدیک برگزیدہ ہیں اور رستگاری پائے ہوئے ہوتے ہیں۔

اقسام معرفت:

مکتوب چہاردہم میں سائل کے سوال پر اقسام معرفت کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ معرفت کی تین قسمیں ہوا کرتی ہیں: معرفت عوام و معرفت خاص اور خواص الخواص۔ عام کی معرفت یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرے اوامر ونواہی کی رعایت کرے اور دائمی طور پر اعمال صالحہ بجالاتا رہے اس معرفت کا ثمرہ بہشت اور دیدار باری تعالی ہے۔

معرفت خاص یہ ہے کہ اضافات ساقت کر دیے جائیں یعنی اللہ کے سوا ہر چیز سے بے تعلق ہو جائے چنانچہ معرفت خاص کے حاملین کے قلوب غیر حق سے بے سکون رہتے ہیں اس کی آزمائشوں پہ صابر اور اس کی نعمتوں پہ شاکر رہتے ہیں کبھی رویت دیدار کی لذت امید پاتے ہیں کبھی مشاہدے کی نعمت کے مراقبے میں ہوتے ہیں۔

تیسری قسم خاص الخاص کی معرفت سب سے اعلی وارفع ہے کہ اس معرفت کے حامل واجب الوجود کا مشاہدہ انہیں حاصل ہوتا ہے چنانچہ خود کو اور کل کائنات کو حق تعالی سبحانہ کی شہود میں گم ہو جاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو کلیتاً واصلان حق تعالی ہیں اور معرفت اسی درجے کو درجۂ علیا و مرتبہ قصوی کہتے ہیں۔

استقامت عمل:

حضرت مخدوم مکتوب پنجاہ و ھفتم میں استقامت کے ساتھ عمل کئے جانے کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ عمل میں اصل چیز استقامت ہے اس کا نتیجہ محبت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا تو جواباً فرمایا کہ آپ کا عمل استقامت تھا؛ یعنی جو بھی عمل حضور شروع فرماتے اس میں ذرا بھی خلل پڑنے نہیں دیتے، لہذا اوراد و وظائف کا لمبا

ہونا اورزیادتی منظورنہیں ہے بلکہ استقامت، پابندی وہمیشگی منظور ہے۔

مروت وفتوت کی اصطلاح:

حضرت مخدوم نوشہ توحید کے مکتوبات میں صوفیانہ اصطلاحوں کی تشریح بھی ملتی ہے،مثلاً صوفیا کے یہاں ایک اصطلاح مروت و فتوت ہے ایک سائل کے جواب میں اس کی تشریح فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں مال واسباب میں سخاوت کرنے کومروت کہتے ہیں اور جسم و جہاں کی سخاوت کوفتوت کہتے ہیں جوشخص اس منزل ومرتبہ میں ثابت قدم نہیں ہے تصوف میں اس کا قدم رکھنا ہرگز قابل قبول نہیں اوراس قدم سے بھی اعلی فتوت ہے۔فتوت کی سب سے اعلی تعریف ابوبکر وراق نے کی ہے الفتی من لاخصم لہ۔جب صوفی ذرہ برابر اپنی خودی کے ساتھ ہے جذبۂ الٰہی یعنی اللہ کی کششوں میں اس کے لیے ہرسمت سے دشمنی کا صدور ہوتا ہے۔

عربوں کا دستور:

مخدوم حسین کے مضامین مکتوبات میں اسرار رموز کی تشریح میں واقعات اور تہذیب وثقافت کی باتوں سے بھی استفادے نظر آتے ہیں جوتاریخی حیثیت سے ایک دلچسپی کا سامان ہیں؛ چنانچہ اللہ نور السماوات والارض کی تفسیر میں اٹھویں صدی ہجری کی ایک عربی تہذیب کی لفظی تصویر مکتوب میں پیش کی گئی ہے،مولف مکتوب فرماتے ہیں کہ عربوں کا یہ دستور ہے کہ گھروں کی روشنی کے لئے زیتون کے درخت سے تیل نکالتے ہیں اوراس تیل کو چراغ میں ڈالتے ہیں اوراس چراغ کو شیشے کی قندیل میں رکھتے ہیں پھراس قندیل کو طاق میں رکھ دیتے ہیں، اس تیل کی مدد سے چراغ ایسا روشن ہوتا ہے جیسے شیشے کی قندیل تابانی اور صفائی میں کوکب دری یعنی نہایت چمکتے ہوئے روشن تارے کے جیسے دکھائی دیتی ہے بلکہ وہ چراغ ایسی روشنی دیتا ہے کہ شیشے کی قندیل اور وہ طاق سب کا سب ایک مشعل کے طور پر معلوم ہوتا ہے۔

المختصر یہ کہ مخدوم حسین نوشہ توحید کا مکتوبات کا مجموعہ نفس مضامین اور محاسن ولطائف کے لحاظ سے آٹھویں صدی ہجری کے تصوف لٹریچر کا ایک شاندار حصہ ہے، جوشریعت وطریقت کے اہم، بنیادی اوراعلی مسائل کی تشریحات میں پرارزش سرمایہ تصوف کا ایک قدیم منبع ہے۔

منابع:

اخبار الاخیار؛ شیخ عبدالحق دہلوی؛ مکتبہ رحیمیہ

مجموعہ مکتبوبات شیخ حسین قلمی؛ بیتی کتب خانہ راقم الحروف

مجموعہ مکتوبات مع ترجمہ

☆☆☆

سید محمد ظفر اقبال
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مراۃ العروس میں تربیت نسواں کے مسائل: ایک جائزہ

مراۃ العروس ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا ناول ہے جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ مراۃ العروس نہ صرف نذیر احمد کا پہلا ناول ہے بلکہ اسے اردو ناول نگاری میں بھی اولیت حاصل ہے۔ فنی لحاظ سے اس ناول میں بہت سی کمیاں وخامیاں موجود ہیں جن کی بنیاد پر اس کی اولیت پر محققین و ناقدین کے درمیان اختلاف نظر آتا ہے لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مراۃ العروس سے ہی اردو ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ اردو ناول کے آغاز و ارتقاء پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں؛

> ''...جب کوئی اردو ناول کے ارتقاء کا جائزہ لینے بیٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ فن کے اس دل کش سفر کی پہلی منزل کون سی ہے، اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے تو اس کی نظر سب سے پہلے نذیر احمد کے ان ناولوں پر پڑتی ہے جنہیں بعض نقادوں نے ناول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس انکار یا تامل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نذیر احمد کے جن قصوں کو متفقہ طور پر ناول کا نام دیا گیا ہے ان میں فن کے وہ لوازم موجود نہیں ہیں جن کا مطالبہ جدید ناول سے کیا جاتا ہے...''

(داستان سے افسانے تک: ص؛ 61)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کی تائید ہو جاتی ہے کہ مراۃ العروس سے ہی اردو ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس میں وہ فنی لوازم موجود نہیں ہیں جن کا مطالبہ جدید ناول سے کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے پہلی بار اردو میں باضابطہ طور پر ناول نگاری کی بنیاد ڈالی، چونکہ یہ ان کی پہلی کوشش تھی اور ان کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اس لیے مراۃ العروس میں کچھ خامیاں جگہ پا گئیں جن کو اگر پس پشت ڈال دیا جائے تو اس ناول کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اسی لیے مراۃ العروس کو اس عہد میں کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور حکومت وقت کی جانب سے نذیر صاحب کو اس کاوش پر ایک ہزار روپے کا انعام ملا۔

مراۃ العروس ایک اصلاحی ناول ہے جس میں مسائل نسواں خاص طور سے امور خانہ داری، تعلیم کی اہمیت وافادیت، پرورش اولاد کے مسائل، سلیقہ مندی و سلیقہ شعاری، لڑکیوں کی شادی شدہ زندگی اور انہیں سسرال میں پیش آنے والے مسائل کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ نذیر احمد نے دو متضاد نسائی کردار یعنی اکبری اور اصغری کے ذریعے تعلیم و تربیت، خوش مزاجی، سلیقہ مندی، خوش اخلاقی، ایثار، محبت اور جذبۂ خدمت جیسی خصوصیات کے فوائد کو بیان کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جن اشخاص میں یہ خوبیاں موجود ہوتی ہیں ان کی زندگی

پرسکون اور خوش وخرم گزرتی ہے اور جو لوگ ان عادات صالحہ سے واقف نہیں ہوتے وہ ہمیشہ غمزدہ اور مفلوک الحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ڈاکٹر اشفاق محمد خاں 'مراۃ العروس' کے فن اور موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''....مراۃ العروس کا موضوع امور خانہ داری یا مستورات کی اصلاح معاشرت کہا جاسکتا ہے یہ کہانی دہلی کے ایک متوسط شریف مسلمان خاندان کی کہانی ہے جس میں اس خاندان کے طرز معاشرت کی ہو بہو عکاسی کر کے یہ دیکھایا گیا ہے کہ کس طرح خواتین اپنی توہم پرستی، جہالت اور کج روی کی بنا پر ہمیشہ رنج وآلام کا شکار رہتی ہیں....''

(نذیر احمد کے ناول،تنقیدی مطالعہ:ص؛56)

مراۃ العروس کا پس منظر دہلی کے ایک متوسط طبقے کا گھرانا ہے۔نذیر صاحب نے اس گھر کے ماحول، پرورش، تربیت، رسم و رواج، رہن سہن اور طور طریقوں کو بنیاد بنا کر اس عہد کے متوسط طبقے کے گھرانوں میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے مسائل کو بیان کیا ہے۔اس دور میں عام طور سے عورتوں کی تعلیم کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب تصور کیا جاتا تھا جس کے نتیجے میں جہالت اور توہم پرستی کی بنا پر گھروں میں لڑائی جھگڑے اور دوسرے مسائل پیدا ہوتے تھے۔نذیر صاحب خود مراۃ العروس کے دیباچے میں راقم طراز ہیں؛

''....اس ملک میں مستورات کو پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں مگر پھر بھی بڑے شہروں میں بعض شریف خاندانوں کی اکثر عورتیں قرآن مجید کا ترجمہ، مذہبی مسائل اور نصائح کے اردو رسالے پڑھ لیا کرتی ہیں....''(مراۃ العروس:ص؛1)

مراۃ العروس کو ڈپٹی نذیر احمد نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔پہلے حصے میں اکبری کا قصہ بیان ہوا ہے جو اپنے والدین اور ننہالی اعزا کی چہیتی تھی۔لاڈ پیار کی وجہ سے تعلیم وتربیت کی طرف توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت میں ایک کجی پیدا ہو گئی اور وہ ایک بد سلیقہ، بدمزاج، زبان دراز، پھوڑ اور بدتہذیب عورت کی شکل میں سامنے آتی ہے۔جبکہ کہانی کا دوسرا حصہ اصغری کے واقعے پر مشتمل ہے۔یہ اکبری کے بالکل برعکس ہے۔نہ تو بچپن میں اس کا بہت زیادہ لاڈ پیار ہوا اور نہ ہی اس کی تمام خواہشات پوری ہوئیں چنانچہ اس کی شخصیت میں انکسار واعتدال، سلیقہ مندی وسلیقہ شعاری نظر آتی ہے۔

ناول کے شروع میں تقریباً چودہ پندرہ صفحات پر مشتمل نذیر صاحب تقریری انداز میں اصلاحی گفتگو کرتے ہیں جس میں مشاہدات دنیا کے فوائد، تعلیم وتربیت کی اہمیت، امور خانہ داری میں مہارت وغیرہ جیسے موضوعات پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آئندہ زندگی میں ان امور سے کس طرح فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔چونکہ یہ ناول لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے مقصد سے تصنیف کیا گیا تھا اس لیے اس پوری اصلاحی گفتگو میں لڑکیوں کے ساتھ پیش آنے والے مسائل پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔

اس عہد میں خواتین کے ساتھ بڑا عجیب وغریب سلوک روا رکھا جاتا تھا اور انہیں لائق اعتنا تصور نہیں کیا جاتا تھا۔عورتوں سے کسی امر میں صلاح ومشورے کا تصور ہی نہیں تھا اور اگر کسی گھر میں بہت عزت وتوقیر عطاء کی گئی تو صرف اس قدر کہ گھریلو معاملات سے متعلق

مشورہ کرلیا گیا۔نذیر صاحب اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''....گھر کی ٹہل خدمت کے علاوہ دنیا کا کوئی عمدہ کام بھی عورتوں سے لیا جاتا ہے یا کسی عمدہ کام کے صلاح و مشورے میں عورتیں شریک ہوتی ہیں؟۔جن گھروں میں عورتوں کی بڑی عزت اور بڑی خاطرداری ہے وہاں بھی جب عورتوں سے پوچھا جاتا ہے تو یہی ''کیوں بی'' آج کیا ترکاری پکے گی؟....'' (مراۃ العروس:ص؛20)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ جس عہد میں یہ ناول تحریر کیا گیا عورتوں کو کس طرح کے مسائل کا سامنا تھا،لیکن اس اقتباس سے یہ مفہوم نہیں نکالنا چاہے کہ عورتوں پر بہت زیادہ ظلم وستم کا رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔دراصل اس عہد کی خواتین اپنی لاعلمی اور تعلیم کی کمی کی بنیاد پر کسی امر میں مشورہ دینے سے قاصر تھیں اور ناول نگار اسی طرف اپنے قاری کو متوجہ کرنا چاہتا ہے۔

نذیر صاحب لڑکیوں کو اس حقیقت سے بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ والدین کے گھر مختصر ایام کا قیام ہے پھر شادی کے بعد دوسرے گھر جانا پڑتا ہے اور ایک نئے ماحول، نئے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوتی ہے اس عمل میں بہت سے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں،اگر اچھی تعلیم وتربیت ہوئی ہے تو انسان اپنی فہم وفراست اور ذہانت ولیاقت کی مدد سے ان مسائل کو خوبصورتی کے ساتھ حل کرسکتا ہے۔

اکبری جو اس ناول کا ایک اہم کردار ہے اس کی شخصیت میں تمام تر کمیاں وخامیاں موجود ہیں،چونکہ یہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کی چہیتی تھی اس لیے تعلیم وتربیت کی طرف بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت میں بہت سی خامیاں پیدا ہوگئیں جن کے اثرات شادی کے بعد رونما ہوئے۔شوہر اور سسرالی اعزہ کے ساتھ اکبری کا رویہ مخلصانہ نہیں تھا۔وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں محلے کی ان عورتوں سے دوستانہ مراسم استوار کرتی ہے جنہیں اس کی ساس اور دوسرے اہل خانہ پسند نہیں کرتے۔شوہر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بدتمیزی اور بدتہذیبی کا رویہ اختیار کرتی ہے اور آخر کار لڑ جھگڑ کر الگ رہائش اختیار کرلیتی ہے۔نذیر صاحب اکبری کے طرز زندگی اور شوہر، سسرالی رشتے داروں کے ساتھ تعلقات کو بہت تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔یہاں صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں اکبری اپنے شوہر سے جھگڑے میں مشغول ہے اور اپنے والدین کو برا بھلا کہہ رہی ہے؛

''....خدا کی قسم میں نے کہہ دیا مجھ سے زبان سنبھال کر بولا کرو نہیں تو پیٹ پیٹ کر اپنا خون کر ڈالوں گی۔یہ کہہ کر رونے لگی اور اپنے ماں باپ کو کوسنا شروع کیا....'' (مراۃ العروس:ص؛24)

اکبری کی چھوٹی بہن اصغری ہے۔اس کی تعلیم وتربیت پر شروع سے ہی توجہ دی گئی چنانچہ یہ ایک نہایت سلجھی ہوئی سلیقہ مند لڑکی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔اس کی شخصیت میں وہ تمام صفات صالحہ موجود ہیں جن کی مدد سے ایک خوشگوار زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔نذیر احمد اصغری کی تعلیم وتربیت،سلیقہ مندی اور سلیقہ شعاری کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''....بہت عقل مند فہمیدہ اور نیک مزاج تھی چھوٹی سی عمر میں اس نے قرآن شریف کا ترجمہ اور مسائل کی اردو کتابیں پڑھ لی تھیں۔لکھنے میں بھی عاجز نہ تھی گھر کا حال اپنے باپ کو ہفتے کے ہفتے لکھ بھیجا کرتی۔ہر ایک طرح کا

کپڑا سی سکتی تھی اور انواع واقسام کے مزیدار کھانے پکانا جانتی تھی...." (مراۃ العروس:ص؛25)

اصغری کی شادی بھی اسی گھر میں ہوئی جہاں اکبری کی ہوئی تھی لیکن دونوں بہنوں کی شادی شدہ زندگی بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ اکبری نے جہاں اپنی ضد، بدتہذیبی، بداخلاقی اور کم علمی کے بنا پر اپنی زندگی کو دشوار بنا لیا تھا وہیں اصغری نے اپنی تعلیم، تربیت اور حسن اخلاق سے اپنی زندگی جنت نشاں بنالی۔ نذیر صاحب اصغری کی شادی شدہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"....اصغری نے گھر کے کام میں بتدریج اس طرح دخل دینا شروع کیا کہ شام کو محمودہ سے روئی منگا کر چراغ کی بتیاں بٹ دیا کرتی، ترکاری بنالیتی، محمودہ کا پھٹا ادھڑا کپڑا سی دیتی، ساس اور میاں کے لیے پان بنا دیا کرتی، شدہ شدہ باورچی خانے تک جانے اور ماما عظمت کو بھوننے بگھارنے میں صلاح دینے لگی...." (مراۃ العروس:ص؛67)

اصغری نے صرف سسرال کو اپنا گھر ہی تصور نہیں کیا بلکہ وہاں کی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے انجام بھی دیا بلکہ اپنی علمی لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک مکتب بھی قائم کیا جس میں محلے کی لڑکیوں کی تعلیم وتعلم کا معقول نظم تھا۔ اس مکتب کا اتنا شہرا ہوا کہ علاقے کے روساء بھی اپنی بچیوں کو اس مکتب میں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ اصغری نے صرف گھریلو معاملات کو خوبصورتی کے ساتھ انجام نہیں دیا بلکہ اپنی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوہر اور خسر کے ساتھ صلاح ومشورے میں بھی شریک ہوئی اور بہت سے گھریلو اور باہر کے معاملات کو حل کیا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصغری اور اس کے خسر کے درمیان قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں جو صلاح ومشورہ ہوتا اس سے ایک چھوٹا سا اقتباس پیش کیا جائے؛

"....ماما نے کہا ایک کا حساب ہو تو میں زبانی بھی یاد رکھوں۔ بنیا، بزاز، قصائی، کنجڑا، حلوائی سب کا دینا ہے اور ہزاری مل کا حساب ایک الگ رقم ہے جس کو جتنا دینا ہو مجھ کو دیجیے دے آؤں آپ کے نام جمع ہو جائے گا۔ مولوی صاحب تو سیدھے سادھے آدمی تھے دینے کو آمادہ ہو گے اصغری نے کہا یوں علی الحساب دینے سے فائدہ، پہلے ہر ایک کا قرض معلوم ہو تب اس کو سوچ سمجھ کر دینا چاہئے...." (مراۃ العروس:ص؛93)

مراۃ العروس میں "ماما" یعنی گھریلو کام کاج میں مدد دینے والی عورتوں کی بھی بہترین عکاسی موجود ہے کہ کس طرح یہ عورتیں گھر کی سیدھی سادھی خواتین کو اپنے چھل کپٹ میں پھنسا کر بیوقوف بناتی ہیں اور مختلف طریقوں سے انہیں لوٹتیں ہیں اور یہ بیچاری گھریلو خواتین اپنی کم علمی اور سیدھائی میں ان کے جال میں پھنس کر روپئے پیسے برباد کرتی ہیں۔ مراۃ العروس کے مطالعہ کے بعد اس عہد کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اگرچہ اس ناول کا موضوع اصلاحی ہے اور خواتین کی تعلیم وتربیت اور امور خانہ داری کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے لیکن ضمنی طور پر اس عہد کے سماج اور رسم ورواج کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ آج بھی اس ناول کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ عہد حاضر کے پس منظر میں اگر اس ناول کا مطالعہ کیا جائے تو آج کے معاشرے میں جو مسائل خواتین کو درپیش ہیں اس کا حل اور تدارک بھی اس ناول میں موجود ہے۔

☆☆☆

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magazine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-8, Issue:- 10 to 12

October To December 2021

Price: Monthly:-50rs., Annual:- 500rs.

Supervision

Dr. Syed Adil Ahmad, Department of Archaeology, State Museum, Hyderabad Telangana

Editor

Syed Iliyas Ahmad Madni,

Honorary Editors:

Professor Sahebzada Saulat Ali Khan

Professor E. A. Haidari

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad, Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Review Committee

Prof. Masood Anwar Alavi, AMU, Aligarh
Prof. Umar Kamaluddin, LU, Lucknow
Prof. Aziz Bano, MANUU, Hyderabad
P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad
Dr. Zareena Perveen, Director of Archieves, Hyd.
Dr. S. Asmath Jahan, MANUU, Hyderabad
Dr. M. A. Naeem, Hyderabad
M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.
Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai
Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad

Editorial Board

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, AMU, Aligarh
Prof. Shaid Naukhez Azmi, MANUU, Hyderabad
Dr. Mohd. Aqeel, BHU, Varanasi
Dr. Md. Ehteshamuddin, AMU, Aligarh
Dr. Mohd. Qamar Alam, AMU, Aligarh
M. Tauseef Khan Kaker, AMU, Aligarh
Ahmad Naved Yasir, AMU, Aligarh
Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad
Mutabbi Ali Khan, Editor Urdu Khabar.in, Hyderabad

Articles

	Article	Author	Pg.
1	Saadi Shirazi: The Messenger of Humanity	Dr. Mohd. Qamar Alam	3
2	अवध के क़सबों का एक संक्षिप्त अवलोकन	डॉ. अहमद नवेद यासिर	11

Dr. Mohd. Qamar Alam
Assistant Professor, Department of Persian, AMU, Aligarh

Saadi Shirazi: The Messenger of Humanity

Abstract:

Saadi Shirazi (Maslih al-Din Maslih ibn Abdullah Shirazi) is one of the most influential Persian poets, prose writers, social reformers, and Sufi thinkers of the 7th century Hijri. His works, particularly *Būstān* and *Gulistān*, provide timeless ethical guidance and spiritual insight, emphasizing universal human values such as compassion, justice, humility, and moral integrity. This paper explores Saadi's life, philosophy, and teachings, demonstrating their enduring relevance in addressing moral and spiritual challenges in the modern world. Through his poetry and prose, Saadi emerges as a teacher, reformer, and messenger of humanity.

Keywords: Saadi Shirazi, Persian literature, humanism, ethics, spirituality, Gulistān, Būstān

Introduction

Saadi's teachings remain profoundly relevant in the contemporary world. The universality and timelessness of his work distinguish it from other literary productions. His verses and anecdotes continue to enlighten humankind about ethics, justice, compassion, contentment, humility, and repentance. While deeply aligned with Islamic teachings, his worldview rests fundamentally on humanitarian values. Saadi Shirazi was not merely a poet; he

was a reformer, moral guide, philosopher, and keen observer of human nature.

Būstān and *Gulistān* constitute the pillars of Persian ethical literature, establishing the foundations of didactic poetry. Their study not only enriches literary appreciation but also nourishes spiritual refinement, offering guidance amid modern moral and social crises.

Saadi's Relevance in the Modern World

Despite unprecedented material advancement, contemporary society faces moral and spiritual crises. Humanity is losing its essence; social insensitivity has become widespread; injustice and corruption dominate; and education is often reduced to the pursuit of credentials. In such an age, Saadi's teachings call for a new moral order founded on goodness, justice, brotherhood, and universal human dignity. His thought encourages compassion, patience, humility, self-restraint, and service to humanity. Even today, his writings embody humanism, tolerance, and truthfulness.

Life and Philosophy of Saadi

Muslih al-Din Maslih ibn Abdullah Shirazi, known as Saadi, was a multifaceted personality: Sufi, social reformer, scholar, traveler, physician, and linguist. He provided ethical, social, and spiritual guidance that transcends temporal boundaries. His poetry reflects love, tolerance, compassion, and knowledge of God, emphasizing the dignity of humanity across differences of religion, race, and social status.

One of Saadi’s most celebrated verses exemplifies his universal humanism:

بنی آدم اعضای یکدیگرند
کہ در آفرینش ز یک گوهرند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار
دگر عضو هارا نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی
نشاید کہ نامت نهند آدمی

Translation:
The children of Adam are limbs of one another,
Created from the same essence.
If one member suffers, the others cannot remain at rest.
He who feels no grief for others’ pain
Does not deserve the name of human.

Saadi’s personality encompassed multiple roles, making his life and works a rich source of study. His contributions have influenced literature, ethics, and spirituality, not only in the East but also globally.

Ethical and Spiritual Teachings

Invocation of God

بہ نام خدایی کہ جان آفرید
سخن گفتن اندر زبان آفرید
خداوند بخشنده دستگیر
کریم خطا بخش پوزش پذیر

Translation:
In the name of God who created the soul,

And bestowed upon man the gift of speech.
The Lord—Generous and Supportive,
The Clement, who forgives sins and accepts repentance.

Supplication for Mercy

کریما بہ بخشای بر حال ما
کہ هستم اسیر کمند هوا
نداریم غیر از تو فریادرس
توئي عاصیان را خطا بخش و بس
نگهدار ما را ز راه خطا
خطا در گذار و صوابم نما

Translation:
O Generous Lord! Have mercy on our state, for we are trapped in the snares of our own desires. We have no helper except You, and You alone forgive the sins of the erring. Protect us from the path of error, overlook our faults, and guide us toward righteousness.

Virtues and Ethical Principles

Saadi's works systematically explore ethical principles, including:

Reflection on the Workmanship of Almighty God:

Reflect upon the magnificent golden dome of the sky—firmly suspended without pillars. God has assigned different stations to His creation: some as guardians, others as rulers; some as seekers of justice, others as collectors of tribute; some dwell in poverty, others in wealth; some enjoy permanence, others face mortality. Some sit on mats while others occupy thrones; some wear coarse garments while others don silk. Some are poor, others affluent; some are healthy, others frail; some are righteous, others erring.

Some enjoy pleasure, others suffer sorrow; some hold power, others pay taxes; some rejoice, others are afflicted. Such is the divine diversity which invites man to reflection. Saadi says:

نگه کن برین گنبد زرنگار   که سقفش بود بی ستون استوار
یکی پاسبان و یکی پادشاه   یکی داد خواه و یکی باج خواه
یکی درعنا و یکی درغنا   یکی را بقا و یکی را فنا
یکی برحصیرو یکی برسریر   یکی درپلاس و یکی درحریر
یکی بینوا و یکی مالدار   یکی نامراد و یکی کامگار
یکی تندرست و یکی نا توان   یکی سال خورد و یکی نوجوان
یکی درصواب و یکی درخطا   یکی دردعاء و یکی دروغا
یکی نیک‌خلق و یکی تندخوی   یکی بردبارو یکی جنگجوی
یکی درگلستان راحت مقیم   یکی باغم ورنج و محنت ندیم
یکی باجدارو یکی تاج دار   یک سرفرازو یکی خاکسار
یکی شادمان و یکی درد مند   یکی کامران و یکی مستمند

In Praise of the Prophet (ﷺ)

زبان تا بود دردهان جایگیر   ثنای محمد بود دلپذیر
حبیب خدا اشرف انبیا   که عرش مجیدش بود متکا
...که بگذشت ازقصرنیلی رواق   سوارجهانگیریکران براق

As long as the tongue rests in the mouth, praising Muhammad (ﷺ) brings delight to the heart. He is the Beloved of God, the most noble of all Prophets, whose station is near the Throne of Majesty. He rode the celestial steed *Buraq*, surpassing even the blue celestial palaces.

Address to the Self (Nafs)

چهل سال عمرعزیزت گذشت   مزاج تو ازحال طفلی نگشت

همه با هوا و هوس ساختی — دمی با مصالح نه پرداختی

مباش ایمن از بازی روزگار — مکن تکیه برعمرنا پایدار

O self! Forty precious years of your life have passed, yet your nature remains childish. You have always pursued your desires and never once reflected on righteousness. Do not rely on this fleeting life nor remain heedless of time's deceptions, for the world is a mirage that changes in an instant.

The Virtue of Generosity

سخاوت کند نیک بخت اختیار — که مرد از سخاوت شود بختیار

در اقلیم لطف و سخا میرباش — بلطف و سخاوت جهانگیرباش

Only the fortunate choose generosity, for a man's true fortune arises from his liberality. Conquer the world through kindness, and be a leader in the realm of compassion—for generosity is the key to honor and acceptance.

Condemnation of Miserliness

اگرچرخ گردد بکام بخیل — در اقبال باشد غلام بخیل

اگر درکفش گنج قارون بود — وگرتابعش ربع مسکون بود

... بہشتی نباشد بحکم خبر — بخیل اربود زاهد بحرو بر

Even if fate favors the miser and fortune becomes his servant—even if he possesses the treasure of Qarun and rules a quarter of the earth—he remains blameworthy. Even if he is ascetic on land and sea, he is deprived of Paradise according to the Prophetic tradition. Though wealthy, the miser suffers humiliation like a beggar. The generous enjoy their wealth, while the miser is consumed by anxiety over gold and silver.

The Excellence of Humility

دلا گرتواضع کنی اختیار   شود خالق دنیا ترا دوستدار
تواضع کند هرکه هست آدمی   نه زیبد زمردم بجزمردمی
تواضع بود حرمت افزای تو   کند دربهشت برین جای تو
تواضع زیادت کند جاه را   که ازمهرپرتوبود ماه را
تواضع کلید درجنت است   سر افرازی و جاه را زینت است
گرامی شوی پیش دلها چوجان   تواضع عزیزت کند درجهان

O heart! If you adopt humility, the Creator will love you and people will cherish you. Humanity's true adornment is humility. It elevates your spiritual rank and opens the doors of Paradise. Humility increases honor just as the moon receives its light from the sun. It is the key to Paradise and the ornament of dignity. Through humility you will become beloved on earth and cherished like the soul itself.

Condemnation of Arrogance

تکبرمکن زینهار ای پسر   که روزی زدستش درآیی بسر
تکبربود عادت جاهلان   تکبرنیاید زصاحب دلان
کسی را که خصلت تکبربود   سرش پرغرورو تصوربود
چودانی تکبرچرا می کنی   خطا می کنی و خطا می کنی

Translation:
Beware, my son—never be arrogant, for one day this very pride will bring you down. Arrogance is the habit of ignorant people; the wise keep away from it. The arrogant man's mind fills with delusion and conceit. If you know arrogance is evil, why do you repeat the same mistake?

The Virtue of Knowledge

بنی آدم ازعلم یابد کمال   نه ازحشمت و جاه و مال و منال

چوشمع ازپی علم باید گداخت　　　که بی علم نتوان خدا را شناخت
ترا علم دردین ودنیا تمام　　　که کارتو ازعلم گیرد نظام
که بی علم بودن بود غافلی　　　میاموزجزعلم گرعاقلی

The children of Adam attain perfection through knowledge, not through wealth or social status. As a candle melts to give light, a person must sacrifice for the sake of knowledge. Without knowledge, one cannot truly know God. Both worldly and spiritual order rest upon knowledge. If you are wise, learn nothing but knowledge, for ignorance leads to heedlessness. Seeking knowledge is obligatory upon every Muslim man and woman, as the Prophet (ﷺ) taught.

Humility in Knowledge

دعوی مکن که برترم از دیگران بعلم　　　چوکبر کردی از همه دونان فروتری

علم آدمیت است و جوانمردی و ادب　　　ورنه ددی به صورت انسان مصوری

Do not claim superiority over others due to your knowledge. If arrogance enters your heart, you will fall from grace. True knowledge teaches humanity, chivalry, and etiquette; otherwise, you are but a beast in human form.

The Virtue of Justice

چوایزد ترا این همه کام داد　　　چرا برنیاری سرانجام داد
ترا مملکت پایداری کند　　　اگرمعدلت دستیاری کند
جهان را بانصاف آباد دار　　　دل اهل انصاف را شاد دار
جهان را به ازعدل معمارنیست　　　که بالاترازمعدلت کارنیست
اگرخواهی ازنیکبختي نشان　　　درظلم بندی براهل جهان

When God has granted you such blessings, why do you not administer justice? If justice becomes your companion, your kingdom will remain strong. Build the world with fairness and gladden the hearts of the just. Nothing builds the world better than justice. If you seek honor, shut the doors of oppression.

Condemnation of Oppression

خرابی زبیداد بیند جهان　　چوبستان خرم زباد خزان
کسی کاتش ظلم زد درجهان　　برآورد ازاهل عالم فغان
مده رخصتِ ظلم درهیچ حال　　که خورشید ملکت نیابد زوال
مکن برضعیفان بیچاره زور　　بیندیش آخرزتنگی گور
که ظالم بدوزخ رود بی سخن　　ستم برضعیفان مسکین مکن

The world is ruined by tyranny, just as the spring garden is destroyed by autumn winds. Whoever ignites the fire of oppression brings forth the cries of humanity. Never allow injustice, lest your dominion perish. Do not oppress the weak; remember the narrowness of the grave. Oppress not the poor and helpless, for the oppressor shall enter Hell without question.

The Virtue of Contentment

دلا گرقناعت بدست آوری　　دراقلیم راحت کنی سروری
اگرتنگ دستی زسختی منال　　که پیش خردمند هیچ است مال
ندارد خردمند ازفقرعار　　که باشد نبی را زفقرافتخار
اگرداری ازنیک بختی نشان　　زنورقناعت برافروزجان

O heart! If you attain contentment, you will rule the kingdom of peace. Do not complain of poverty, for wealth means nothing to the wise. The intelligent feel no shame in poverty—the Prophet (ﷺ) was proud of it. Illuminate your soul with the light of contentment if you hold a sign of true fortune.

Condemnation of Greed

ایا مبتلا گشته در دام حرص	شده مست و لا یعقل از جام حرص
هر آنکس که دربند حرص اوفتاد	دهد خرمن زندگانی بباد
چرا می کشی محنت ازبهر مال	که خواهد شدن ناگهان پایمال

Translation:
O you trapped in the snare of greed, intoxicated by its cup!
Whoever falls captive to greed destroys the harvest of his life.
Why toil for wealth that will vanish in an instant?

The Virtue of Obedience and Worship

کسی را که اقبال باشد غلام	بود میل خاطر بطاعت مدام
بطاعت بود روشنائی جان	که روشن زخورشید باشد جهان
سعادت زطاعت میسر شود	دل از نور طاعت منور شود
اگر حق پرستي كني اختيار	در اقلیم دولت شوی شهریار
بآب عبادت وضو تازه دار	که فردا زآتش شوی رستگار
نماز از سر صدق برپای دار	که حاصل کنی دولت پایدار
زتقوی چراغ روان برفروز	که چون نیک بختان شوی نیکروز

The heart of a truly fortunate person inclines toward worship. Worship is the light of the soul, just as the sun illuminates the world. Happiness is attained through obedience, and the heart becomes radiant with its light. If you truly serve God, you will become a leader in the realm of prosperity. Keep your ablution fresh with the water of worship so that you may be saved from Hellfire. Establish prayer with sincerity so that you may gain eternal fortune. Light the lamp of piety within your heart so that, like the blessed ones, you become truly happy.

The Virtue of Gratitude

ترا مال و نعمت فزاید ز شکر　　ترا فتح از در درآید ز شکر
نفس جز بشکر خدا بر میار　　که واجب بود شکر پروردگار
ولی گفتن شکر اولی ترست　　که اسلام را شکر او زیور است
زیادت کند شکر مال و مقال　　زیادت کند شکر جاه و جلال

Gratitude increases one’s wealth and blessings, and opens the doors of success. Let no breath pass without thanking God, for gratitude is obligatory. Expressing gratitude is most virtuous—gratitude is the adornment of Islam. Gratitude enhances dignity, honor, and prosperity.

The Virtue of Patience

ترا گر صبوري بود دستیار　　بدست آوری دولت پایدار
صبوري بود کارپیامبران　　نه پیچند زپی روی دین پروران
صبوري گشاید درکام جان　　که جز صابری نیست مفتاح آن
صبوري برآرد مراد دلت　　که ازعالمان حل شود مشکلت
صبوري ترا کامکاري دهد　　زرنج و بلا رستگاري دهد

If patience becomes your helper, you will attain enduring fortune. Patience is the attribute of the Prophets; the pious never turn away from it. Patience opens the doors of the heart’s desires, and nothing but patience can unlock them. A patient person attains the fulfillment of his wishes, and scholars resolve their difficulties with patience. Patience brings success and delivers from hardship.

The Virtue of Truthfulness

دلا گرکني راستي اختیار　　شود دولتت همدم و بختیار
نه پیچد سرازراستی هوشمند　　که ازراستی نام گردد بلند
به ازراستی درجهان کارنیست　　که درگلبن راستی خارنیست

O heart! If you adopt truthfulness, fortune and prosperity will accompany you. The wise never deviate from truth, for truth elevates one’s reputation. No deed is better than truth in this world, for the garden of truth bears no thorns.

Do Not Place Hope in People

ازین پس مکن تکیه برروزگار   که ناگه زجانت برآرد دمار
مکن تکیه برٔملک و جاه و حشم   که پیش ازتو بودست و بعد ازتوهم
مکن بد که بد بینی ازیارنیک   نمي رويد ازتخم بد، بارنیک

Place no trust in the world—for it may suddenly destroy you. Do not rely on kingdom, rank, or army—they existed before you and will remain after you. Do no evil, for even a good friend will repay evil with evil. A bad seed never yields good fruit.

The Transience of the World

بسا پادشاهان سلطان نشان   بسا پهلو انان کشورستان
بسا ماه رویان شمشاد قد   بسأمشک بویان خورشید خد
بسا ماهرویان نو خاسته   بسا نو عروسان آراسته
بسا نامدارو بسا کامگار   بسا سرو قد و بسا گلعذار
که کردند پیراهن عمرچاک   کشیدند سر درگریبان خاک
ثباتی ندارد جهان ای پسر   به غفلت مبرعمردروی بسر
منه دل برین کاخٔخوم هوا   که می بارد ازآسمان صد بلا
منه دل برین دیرکهنه خراب   که خالی نباشد زرنج و عذاب
منه دل برین دیرناپایدار   زسعدی همین یک سخن یاد دار

Many mighty kings have passed away, many warriors and conquerors have perished. Many beautiful, graceful, moon-faced maidens, many perfumed and adorned brides, many renowned and successful people—all tore the garment of life and buried

their heads in the dust. Their harvest of life was scattered by the wind, and today no trace of them remains. The world is not permanent, my son—do not waste your life in heedlessness. Do not attach your heart to this alluring palace, for calamities fall from the sky without pause. Do not set your heart on this ancient, decaying abode, for it is never free of sorrow and hardship. Do not attach your heart to this fleeting world—and remember this one counsel of Saadi forever.

Conclusion

Saadi Shirazi emerges as a timeless teacher, reformer, and guide. His works transcend the literary sphere, offering ethical, social, and spiritual solutions for the human condition. In a world beset by moral decay, injustice, and spiritual neglect, Saadi's teachings illuminate the path of compassion, humility, justice, and human dignity. His poetry and prose continue to inspire, reminding us that the essence of humanity lies not in material accumulation but in ethical living and spiritual reflection.

Through *Būstān* and *Gulistān*, Saadi remains a messenger of humanity, a beacon whose teachings are as indispensable today as they were seven centuries ago.

डॉ. अहमद नवेद यासिर

फ़ारसी विभाग, अलीगढ़ मुस्लिम विश्वविद्यालय, अलीगढ़

अवध के क़सबों का एक संक्षिप्त अवलोकन

अवध, जिसे कभी ओध, अवध प्रदेश या अवध-राज्य के नाम से जाना जाता था, भारतीय उपमहाद्वीप का वह क्षेत्र है जिसने सदियों से सांस्कृतिक, राजनीतिक और सामाजिक दृष्टि से अत्यंत महत्त्वपूर्ण भूमिका निभाई है। इस प्रदेश को केवल इसकी राजधानी लखनऊ, फैज़ाबाद या बाराबंकी के लिए नहीं जाना जाता बल्कि उन असंख्य क़सबों के लिए भी पहचाना जाता है, जिन्होंने यहाँ की तहज़ीब, भाषा, साहित्य, संगीत और सामाजिक ढाँचे को विशिष्ट और अनूठा बनाया। अवध के क़स्बे इस भूभाग की आत्मा हैं।

ये वे छोटे नगर हैं जहाँ ग्रामीण सौम्यता और शहरी नफ़ासत का सुंदर मेल मिलता है; जहाँ पुरानी हवेलियों का इतिहास, पुराने बाज़ारों की चहल-पहल, तंग गलियों की कशिश और सामुदायिक जीवन का

सौहार्द मिलकर जीवन की एक ऐसी तस्वीर बनाते हैं जो केवल अवध की रूह को समझने वाले ही महसूस कर सकते हैं।

अवध के क़स्बों की चर्चा करते समय यह ध्यान रखना आवश्यक है कि ये केवल भौगोलिक इकाइयाँ नहीं, बल्कि भारतीय सभ्यता के वे सूक्ष्म केंद्र हैं जहाँ भाषा, धर्म, रीति-रिवाज, कला, खान-पान और आदाब की परंपराएँ पीढ़ियों से परिष्कृत होकर एक अनूठे रूप में ढलती रही हैं। हर क़स्बा अपनी अलग पहचान रखता है, परंतु एक साझा भावना—अवध की तहज़ीब—सभी को एक दूसरे से जोड़ती है। यह तहज़ीब विनम्रता, नर्मी, नफ़ासत, मिलनसारी और उच्च सांस्कृतिक समझ पर आधारित है। अवध के क़स्बे इस तहज़ीब को आज भी बहु तहद तक संरक्षित किए हु एहैं।

इन क़सबों का इतिहास अत्यंत प्राचीन है और आरंभिक काल में यह क्षेत्र कई जनजातियों, प्राचीन राजवंशों, मिथकीय कथाओं और आध्यात्मिक यात्राओं का केंद्र रहा। अयोध्या, जिसे अवध का हृदय माना जाता है, भारतीय इतिहास और धर्म दोनों में अत्यंत महत्त्वपूर्ण स्थान रखती है। लेकिन अयोध्या का महिमामंडन केवल इसे एक धार्मिक नगरी बनाकर नहीं हु आ; बल्कि इसके आसपास के छोटे-छोटे क़स्बों ने इसे सांस्कृतिक रूप से संपूर्ण बनाया।

सदियों बाद जब शरावस्तियों और कोशल राजवंशों का प्रभाव घटा और मध्यकालीन दौर आरंभ हुआ, तब भी इन क़सबों का महत्व कम नहीं हुआ। गंगा-जमुनी संस्कृति, सूफ़ी संतों की परंपराएँ, सूफ़ियाना विचारों की स्वीकार्यता, स्थानीय भाषाई मिश्रण, और कृषक समाज की उर्वर भूमि—इन सबने इस प्रदेश को विशिष्ट आकार प्रदान किया।

अवध के क़सबों का वास्तविक विकास नवाबी काल में हुआ, जब लखनऊ, फ़ैज़ाबाद और आसपास के अनेक नगर इस क्षेत्र के राजनीतिक, सांस्कृतिक और आर्थिक केंद्र बन गए। नवाबों की उदारता और कला-प्रेमी स्वभाव ने इन क़सबों को भी प्रभावित किया। संगीत, काव्य, स्थापत्य, पाककला, शिष्टाचार और वस्त्र-संस्कृति का प्रभाव निम्न स्तर तक, यानी क़स्बों तक गहराई से पहुँचा। आज भी इन क़सबों में पुराने नज़ारे, कच्चे-पक्के घरों की बनावट, चौक-बाज़ार का ढांचा, हाट और साप्ताहिक मंडियाँ इस बात की गवाही देती हैं कि यह क्षेत्र कभी कितना समृद्ध और जीवंत रहा है।

अवध के क़स्बों की बुनियादी पहचान उनकी सामाजिक संरचना में निहित है। यहाँ की आबादी प्रायः मिश्रित होती है। हिंदू और मुसलमान दोनों समुदायों की जनसंख्या बहुतायत में पाई जाती है और इन दोनों की सांस्कृतिक मिलीजुली परंपरा ही अवध की अन्तर्संस्कृति (interculture) कहलाती है। विवाह, त्योहार, भोजन, गीत-संगीत और

पारिवारिक आयोजनों में इस सांस्कृतिक सम्मिश्रण की छाप स्पष्ट रूप से देखी जा सकती है। दशकों से दोनों समुदायों के लोग एक दूसरे की खुशियों और ग़मों में शामिल होते रहे हैं। यह सामाजिक सद्भाव अवध के क़सबों की सबसे बड़ी ताकत है, जिसने इन्हें अन्य प्रदेशों से अलग पहचान दी।

क़सबों की तंग गलियाँ, जिनके दोनों ओर छोटे-छोटे घर, पुरानी हवेलियों के फाटक, दरवाजों पर किए गए रंगोली जैसे अलंकरण, और चाय की दुकानों पर होने वाली तफ़रीह, इन सबकी अपनी ही दुनिया है। सुबह के समय क़स्बों का जीवन अपनी विशेष लय के साथ शुरू होता है। मस्जिद की अज़ान और मंदिर की घंटियों का एक साथ गूंजना इस क्षेत्र की विशिष्ट सांस्कृतिक एकता का प्रतीक है। बच्चे स्कूलों के लिए निकलते हैं, किसान खेतों की ओर जाते हैं, महिलाएँ आँगन में सूप चलाती दिखाई देती हैं, और छोटे दुकानदार अपने दुकान का शटर उठाते हुए नए दिन की शुरुआत करते हैं।

अवध के क़स्बों के बाज़ारों में एक अलग ही संसार बसता है। यहाँ पुराने समय से चली आ रही दुकानें, जिन पर पीढ़ियों से व्यापार हो रहा है, आज भी उतनी ही लोकप्रिय हैं। चूड़ी वाले, बनारसी कपड़ों की दूकानें, फ़िरनी और रबड़ी बेचने वाले हलवाई, पुराने तरीक़े से बने मसालों की खुशबू, और स्थानीय कृषि उत्पाद—ये सभी क़स्बों की आत्मा हैं। कुछ

स्थानों के बाज़ारों में नवाबी दौर के निशान आज भी दिखाई देते हैं: लकड़ी के नक्काशीदार फाटक, पुरानी कोठियों के अवशेष, और पीतल-तांबे के बर्तनों की चमक इन बाज़ारों को ऐतिहासिक रंग देती है।

अवध के क़सबों की भाषाई विशेषता भी ध्यान देने योग्य है। यहाँ बोली जाने वाली अवधी, खड़ी बोली, उर्दू और स्थानीय उपभाषाओं का ऐसा सम्मिश्रण है जो कहीं और नहीं मिलता। इन क़सबों की भाषा में मिठास,सम्मान और आदब स्पष्ट दिखाई देता है। बात करने का अंदाज़ बेहद नरम और विनम्र होता है, जिसमें 'कृपा करके', 'हुजूर', 'जनाब', 'भैया', 'बहिनी' जैसे शब्द सहज रूप से प्रयुक्त होते हैं। यह भाषाई शैली इन क़सबों को सांस्कृतिक दृष्टि से मोहक बनाती है।

अवध के क़सबों की धार्मिक और आध्यात्मिक परंपरा बहुत गहरी है। यहाँ अनेक प्राचीन मंदिर, मस्जिदें, मठ, इमामबाड़े और दरगाहें सदियों से आस्था के केंद्र रहे हैं। इनमें से कई ऐसे हैं जिनका इतिहास पाँच-सात सौ वर्ष पुराना है। सूफ़ी संतों की चौखटों पर हिंदू और मुसलमान दोनों आते हैं; मंदिरों में चढ़ावा चढ़ाने वालों में हर समुदाय शामिल होता है। यह आध्यात्मिक विविधता अवध की विशिष्ट विरासत है। अवध के कई क़सबों में उर्स और वार्षिक मेले बड़े उत्साह से मनाए जाते हैं; वहीं दूसरी ओर रामनवमी, दिवाली, मुहर्रम और ईद भी समान रूप से जोश के साथ

मनाई जाती है। यही कारण है कि यहाँ साम्प्रदायिक सौहार्द की जड़ें बहु त गहरी हैं।

अवध के क़सबों की स्थापत्य कला भी उल्लेखनीय है। यहाँ की पुरानी हवेलियाँ, आँगनदार मकान, ऊँचे झरोखे, लकड़ी की कढ़ाई, मिट्टी की दीवारों पर बनाई गई पारंपरिक आकृतियाँ और पक्की-सड़कों के किनारे खड़े बरगद-पीपल के वृक्ष एक अलग दृश्य संसार रचते हैं। कुछ क़सबों में पुरानी कोठियाँ आज भी सुरक्षित हैं, जिनमें बुज़ुर्ग सालों पुराने किस्से सुनाते हैं।िस्तान. इनमें नवाबी दौर की भव्यता और स्थानीय कृषक संस्कृति का संयुक्त प्रभाव दिखाई देता है।

कृषि और व्यापार अवध के क़सबों की आर्थिक रीढ़ हैं। यहाँ के खेत मुख्यतः गेहूँ, धान, गन्ना, दालों और सब्ज़ियों से भरे हु ए हैं। कई क़स्बे विशेष कृषि उत्पादों के लिए प्रसिद्ध हैं, जैसे बाराबंकी का मेंथा, लखनऊ का तम्बाकू क्षेत्र, हरदोई का बाजरा क्षेत्र, और फैज़ाबाद-अयोध्या का गन्ना।

स्थानीय मंडियों में किसानों का व्यवस्थित तंत्र, दलालों से बातचीत, और ग्रामीण-शहरी सौदेबाज़ी एक विशिष्ट आर्थिक माहौल तैयार करती है। साथ ही, क़स्बाई उद्योग—जैसे बढ़ईगीरी, बुनकरी, जूता निर्माण, गाड़ी बनाने का काम, लोहे-पीतल के औज़ार और घरेलू वस्तुओं का निर्माण—आज भी यहाँ बड़ी मात्रा में होता है।

अवध के क़सबों का सामाजिक जीवन अत्यंत जीवंत और मानवीय है। यहाँ रिश्तों को बहुत महत्त्व दिया जाता है। विवाह, जन्मदिन, तिलक, निकाह, मुंडन, चूड़ाकर्म, बारसी, घर-शगुन—इन अवसरों पर पूरे क़स्बे में गूँज रहती है। उत्सव केवल परिवारों तक सीमित नहीं रहते, बल्कि समाज के लोग मिलकर इन्हें मनाते हैं। यह साझी संस्कृति भारतीय जीवन में आदर्श स्वरूप का प्रतिनिधित्व करती है।

अवध के क़सबों की शिक्षा व्यवस्था भी उल्लेखनीय है। कई क़स्बों में पुराने मदरसे, संस्कृत विद्यालय, किताबखाने और सरकारी इंटर कॉलेजों की मजबूत परंपरा रही है। कुछ स्थानों पर शिक्षण संस्थाएँ नवाबी काल में स्थापित हुई थीं, जो आज भी ज्ञान के केंद्र हैं। उर्दू, फारसी, संस्कृत और हिंदी—इन सबका अध्ययन यहाँ कई परिवारों की परंपरा रही है।

अवध के क़सबों में एक अनोखी बात यह है कि समय के आधुनिक दौर में भी यहाँ पुरानी परंपराएँ जिंदा हैं। त्योहारों पर घरों में बनती पारंपरिक मिठाइयाँ, चूल्हे की महक, परंपरागत गीत, शादी-ब्याह के अवसर पर गाए जाने वाले सोहर और कजरी, मुहर्रम के नोहे और रमज़ान की सहरी—ये सब क़स्बाई जीवन को गहराई और मानवीयता प्रदान करते हैं।

अवध के क़स्बों में परिवारिक संरचना सामूहिक होती है। यहाँ संयुक्त परिवार की अवधारणा अब भी काफी हद तक जीवित है। बड़े बुज़ुर्गों का सम्मान, रोज़मर्रा के मुद्दों पर पंचायत-जैसी बैठकों में निर्णय लेना, और सामुदायिक सहयोग की परंपरा आज भी बनी हुईहै।

आज के समय में जब शहरीकरण तेज़ी से बढ़ रहा है, क़स्बों की संरचना भी बदल रही है। नई सड़कें, आधुनिक बाज़ार, डिजिटल सुविधाएँ और बेहतर शिक्षा व्यवस्था ने इन क़सबों को आधुनिकता से जोड़ा है। फिर भी, इन क़सबों की आत्मा—उनकी परंपरा, तहज़ीब और सांस्कृतिक पहचान—अब भी अक्षुण्ण है। यह आधुनिकता और परंपरा का संतुलित मेल इन्हें भारत में विशिष्ट बनाता है।

अवध के क़स्बों की पहचान केवल उनकी भौगोलिक सीमाओं तक सीमित नहीं है; बल्कि वे एक भावात्मक दुनिया हैं, जहाँ इंसान, संस्कृति, भाषा और संवेदनाएँ मिलकर जीवन का एक सुंदर रूप प्रस्तुत करती हैं। यहाँ की हवा में वह मिठास है जिसे महसूस तो किया जा सकता है, पर शब्दों में बाँध पाना कठिन है। यह वह प्रदेश है जहाँ इंसान अपनी जड़ों से जुड़ाव महसूस करता है, जहाँ जीवन सरल और सहज लगता है, और जहाँ संस्कृति हर क़दम पर अपने अस्तित्व का एहसास कराती है।

अवध के क़स्बे वास्तव में भारत की साझा संस्कृति और सदियों पुरानी गंगा-जमुनी तहज़ीब के सबसे सुंदर उदाहरण हैं। इन क़सबों की आत्मा

में बसती यह तहज़ीब आज भी वही संदेश देती है—इंसानियत, प्रेम, विनम्रता, संवाद और सामंजस्य ही जीवन का वास्तविक सौंदर्य है।